اپنی زبان

آٹھویں جماعت کے لیے اردو کی درسی کتاب

विद्ययाऽमृतमश्नुते

एन सी ई आर टी
NCERT

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

NATIONAL COUNCIL OF EDUCATIONAL RESEARCH AND TRAINING

Apni Zaban
Textbook for Class VIII

ISBN 978-81-7450-819-5

پہلا ایڈیشن

فروری 2008 ماگھ 1929

دیگر طباعت

دسمبر 2014 پوش 1936
فروری 2016 ماگھ 1937
اپریل 2017 چیتر 1939
فروری 2018 پھالگن 1939

PD 15T AUS

© نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ 2008

قیمت : ₹ 55.00

جُملہ حقوق محفوظ

- ناشر کی پہلے سے اجازت حاصل کیے بغیر، اس کتاب کے کسی بھی حصے کو دوبارہ پیش کرنا، یاد داشت کے ذریعے بازیافت کے سسٹم میں اس کو محفوظ کرنا یا برقیاتی، میکانیکی، فوٹو کاپینگ، ریکارڈنگ کے کسی بھی وسیلے سے اس کی ترسیل کرنا منع ہے۔
- اس کتاب کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جارہا ہے کہ اسے ناشر کی اجازت کے بغیر، اس شکل کے علاوہ جس میں کہ یہ چھاپی گئی ہے یعنی، اس کی موجودہ جلد بندی اور سرورق میں تبدیلی کر کے، تجارت کے طور پر نہ تو مستعار دیا جاسکتا ہے، نہ دوبارہ فروخت کیا جاسکتا ہے، نہ کرایہ پر دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تلف کیا جاسکتا ہے۔
- کتاب کے صفحہ پر جو قیمت درج ہے وہ اس کتاب کی صحیح قیمت ہے۔ کوئی بھی نظر ثانی شدہ قیمت چاہے وہ ربر کی مہر کے ذریعے یا چپکی یا کسی اور ذریعے ظاہر کی جائے تو وہ غلط متصوّر ہوگی اور ناقابل قبول ہوگی۔

این سی ای آر ٹی کے پبلی کیشن ڈویژن کے دفاتر

این سی ای آر ٹی کیمپس
شری اروندو مارگ
نئی دہلی - 110016 **فون** 011-26562708

108,100 فٹ روڈ ہوسڈے کیرے **ہیلی**
ایکسٹینشن بناشنکری III اسٹیج
بنگلور - 560085 **فون** 080-26725740

نوجیون ٹرسٹ بھون
ڈاک گھر، نوجیون
احمد آباد - 380014 **فون** 079-27541446

سی ڈبلیو سی کیمپس
بمقابل ڈھانکل بس اسٹاپ، پانی ہاٹی
کولکتہ - 700114 **فون** 033-25530454

سی ڈبلیو سی کامپلیکس
مالی گاؤں
گواہاٹی - 781021 **فون** 0361-2674869

اشاعتی ٹیم

ہیڈ پبلی کیشن ڈویژن : محمد سراج انور
چیف ایڈیٹر : شویتا اُپّل
چیف بزنس منیجر : گوتم گانگولی
چیف پروڈکشن آفیسر : ارون چتکارا
ایڈیٹر : سید پرویز احمد
پروڈکشن اسسٹنٹ : اوم پرکاش

سرورق اور آرٹ
وی۔ منیشا

این سی ای آر ٹی واٹر مارک 80 جی ایس ایم کاغذ پر شائع شدہ

سکریٹری، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، شری اروندو مارگ، نئی دہلی نے اسٹیلین گرافکس پرائیویٹ لمیٹڈ، B-3، سیکٹر-65، (گراؤنڈ فلور) نوائڈا 301 201 (یو۔پی) میں چھپوا کر پبلی کیشن ڈویژن سے شائع کیا۔

پیش لفظ

’قومی درسیات کا خاکہ—2005‘ میں سفارش کی گئی ہے کہ بچّوں کی اسکول کی زندگی، ان کی باہر کی زندگی سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ زاویۂ نظر، کتابی علم کی اس روایت کی نفی کرتا ہے جس کے باعث آج تک ہمارے نظام میں گھر اور سماج کے درمیان فاصلے حائل ہیں۔ نئے قومی درسیات کے خاکے پر مبنی نصاب اور درسی کتابیں اسی بنیادی خیال پر عمل آوری کی ایک کوشش ہے۔ اس کوشش میں مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور رٹ کر پڑھنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی بھی شامل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان اقدامات سے قومی تعلیمی پالیسی 1986 میں مذکور ’تعلیم کے طفل مرکوز نظام‘ کی طرف مزید پیش رفت ہوگی۔

اس کوشش کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ سبھی اسکولوں کے پرنسپل اور اساتذہ بچوں میں اپنے تاثرات خود ظاہر کرنے اور ذہنی سرگرمیوں اور سوالوں کے ذریعے سیکھنے کی ہمّت افزائی کریں۔ ہمیں یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ بچوں کو اگر موقعہ، وقت اور آزادی دی جائے تو وہ بڑوں سے حاصل شدہ معلومات سے وابستہ ہوکر، نئی معلومات مرتّب کرتے ہیں۔ آموزش کے دوسرے ذرائع اور محل وقوع کو نظر انداز کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب مجوّزہ درسی کتاب کو امتحان کے لیے واحد ذریعہ بنانا ہے۔ بچّوں کے اندر تخلیقی صلاحیت اور پیش قدمی کے رجحان کو فروغ دینا اسی وقت ممکن ہے جب ہم آموزشی عمل میں بچوں کو بحیثیت شریک کار قبول کریں اور اُن سے اسی طرح پیش آئیں۔ انھیں محض مقررہ معلومات کا پابند نہ سمجھیں۔

یہ مقاصد اسکول کے معمولات اور طریقۂ کار میں معقول تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ روزمرہ نظام الاوقات (Time-Table) میں لچیلا پن اُسی قدر ضروری ہے جتنی کہ سالانہ کیلینڈر کے نفاذ میں سخت محنت کی تاکہ مطلوبہ ایام کو حقیقتاً تدریس کے لیے وقف کیا جاسکے۔ تدریس اور انداز قدر کے طریقوں سے بھی اس امر کا تعین ہوگا کہ یہ درسی کتاب، بچوں میں ذہنی تناؤ اور اکتاہٹ کا ذریعہ بننے کے بجائے ان کی اسکولی زندگی کو خوش گوار بنانے میں کس حدتک مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ نصابی بوجھ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نصاب سازوں نے مختلف سطحوں پر معلومات کی تشکیلِ نو اور اسے نیا رخ دینے کی غرض سے بچوں کی

نفسیات اور تدریس کے لیے دستیاب وقت پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی ہے۔ اس مخلصانہ کوشش کو مزید بہتر بنانے کے لیے یہ درسی کتاب سوچنے اور محسوس کرنے کی تربیت، چھوٹے گروپوں میں بحث ومباحثہ کرنے اور عملاً انجام دی جانے والی سرگرمیوں کو زیادہ اوّلیت دیتی ہے۔

این سی ای آر ٹی اس کتاب کے لیے تشکیل دی جانے والی ''کمیٹی برائے درسی کتاب'' کی مخلصانہ کوششوں کی شکر گزار ہے۔ کونسل زبانوں کی مشاورتی کمیٹی برائے زبان کے چیئرمین پروفیسر نامور سنگھ اور اس کتاب کے خصوصی صلاح کار پروفیسر شمیم حنفی کی ممنون ہے۔ اس درسی کتاب کی تیاری میں جن اساتذہ نے حصّہ لیا، ہم ان کے متعلقہ اداروں کے بھی شکر گزار ہیں۔ ہم ان سبھی اداروں اور تنظیموں کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنے وسائل، مآخذ اور عملے کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ہم وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومتِ ہند کے شعبے برائے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی جانب سے پروفیسر مرنال مری اور پروفیسر جی۔ پی۔ دیش پانڈے کی سربراہی میں تشکیل شدہ نگراں کمیٹی (مانیٹرنگ کمیٹی) کے اراکین کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت اور تعاون ہمیں دیا۔ باضابطہ اصلاح اور اپنی اشاعت کے معیار کو مسلسل بہتر بنانے کے مقصد کی پابند ایک تنظیم کے طور پر این سی ای آر ٹی تمام مشوروں اور آرا کا خیر مقدم کرتی ہے تاکہ کتاب کو مزید غور وفکر کے بعد اور زیادہ کارآمد اور بامعنی بنایا جاسکے۔

نئی دہلی
30 نومبر 2007

ڈائریکٹر
نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

اس کتاب کے بارے میں

کونسل کے ذریعے پیش کی جانے والی یہ نئی درسی کتاب 'اپنی زبان' آٹھویں جماعت کے طالب علموں کو مادری زبان کے طور پر اردو پڑھانے کے لیے ہے۔ اس کا خاص مقصد طلبا کو زبان سے واقف کرانا اور مختلف قسم کی معلومات فراہم کرانا ہے۔ اس کتاب میں نثری اور شعری انتخابات میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ طلبا میں آزادانہ غور وفکر کی عادت پیدا ہو۔ طلبا کی عمر، ان کی نفسیات، دلچسپی اور ان کے درجہ استعداد کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

دورِ حاضر کی تعلیمی ضروریات کے علاوہ قومی، سماجی اور اخلاقی اقدار پر توجہ ضروری ہے۔ اسی لیے مضامین کے علاوہ کہانیاں، نظمیں، تحریریں بھی اِس کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔ ہر سبق کے بعد مشقوں کو ترتیب دیتے وقت تعمیری رویّے (Constructive approach) کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ مشقیں اس طرح وضع کی گئی ہیں کہ طلبا کے ذہن میں نئے الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کے مطالب اور مفاہیم بھی جگہ بنا لیں۔ غور کرنے کی بات اور عملی کام کے تحت طلبا کی فکری اور تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عملی قواعد کا مقصد یہ ہے کہ زبان سے متعلق نئے نکات بتدریج سامنے آتے رہیں، صرف ونحو کی معلومات میں اضافہ ہوتا رہے اور معیاری اردو سمجھنے بولنے اور لکھنے کی عادت مستحکم ہوتی جائے۔ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ ہندوستان کی لسانی تکثیر اور ہندوستانی سماج اور ہندوستانی تہذیب کا مکمل عکس بھی ابھر کر سامنے آجائے۔ قومی ثقافتی ورثے، ہندوستانی آئین کے مزاج، مشترکہ اقدار اور ماحولیات سے بھی طلبا کو واقف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

طلبا پر نصاب کا بوجھ زیادہ نہ ہو، اس لیے کتاب کی ضخامت کم رکھی گئی ہے۔ کتاب کی تیاری کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جو اردو اساتذہ، ماہرین اور ایک خصوصی صلاح کار پر مشتمل تھی۔ ان سبھی کے اشتراک وتعاون سے اس کتاب کو آخری شکل دی گئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مطلوبہ معیار کے مطابق طلبا صحیح اردو لکھنا پڑھنا سیکھ سکیں گے اور اپنے ادب سے بھی روشناس ہوسکیں گے۔ یہی نہیں، بلکہ وہ اردو کی بعض دوسری کتابوں کا مطالعہ کرنے میں بھی دلچسپی لیں گے۔ اساتذہ سے درخواست ہے کہ وہ اس کتاب سے متعلق اپنے عملی اور تدریسی تجربات کی روشنی میں ہمیں اپنے مشوروں سے نوازیں تاکہ آئندہ اس کتاب کو مزید بہتر بنایا جا سکے۔

کمیٹی برائے درسی کتاب

چیئرمین، مشاورتی کمیٹی برائے زبان

نامور سنگھ، پروفیسر ایمرٹس، جواہرلال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

خصوصی صلاح کار

شمیم حنفی، ریٹائرڈ پروفیسر، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

چیف کوآرڈی نیٹر

رام جنم شرما، سابق پروفیسر اور ہیڈ، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اِن لینگویجز، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی

اراکین

احمد محفوظ، سینئیر لیکچرر، شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

خالد اشرف، ریڈر، شعبۂ اردو، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

خالد جاوید، لیکچرر، شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

خالد محمود، ریڈر، شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زبیدہ حبیب، ریڈر، ٹی ٹی آئی کالج، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مجتبیٰ حسین، ریٹائرڈ ایڈیٹر، این سی ای آر ٹی، مافارر یجینسی، اے سی گارڈ، حیدرآباد، آندھرپردیش

محمد عارف عثمانی، ٹی جی ٹی اردو، اینگلو عربک سینئیر سیکنڈری اسکول، اجمیری گیٹ، دہلی

مسرّت جہاں، سینئیر لیکچرر، **سیکنڈری ٹریننگ کالج، مہاپالیکا روڈ، ممبئی، مہاراشٹر**

سلیم اختر، ٹی جی ٹی اردو، **جامعہ سینئیر سیکنڈری اسکول، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی**

ذکی طارق،ڈسٹرکٹ کو آرڈی نیٹر، **ڈسٹرکٹ لٹریسی مشن، وکاس بھون کلکٹوریٹ، راج نگر، غازی آباد، اتر پردیش**

ممبر کوآرڈی نیٹر

چمن آرا خاں، اسسٹینٹ پروفیسر، **ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اِن لینگویجز، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی**

اظہارِ تشکر

اس کتاب میں حفیظ جالندھری، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض اور شوکت تھانوی کی نظمیں، فرحت اللہ بیگ، منٹو، غلام عباس کی کہانیاں اور ممتاز مفتی کا ڈراما شامل ہیں، کونسل ان سبھی کی شکرگزار ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں کاپی ایڈیٹر ڈاکٹر ارشاد نیّر، پروف ریڈر عظیم الدین صدیقی، منوّر امروہوی اور اسسٹنٹ ایڈیٹر محمد اکبر، پروف ریڈر شبنم ناز، ڈی ٹی پی آپریٹرز شمائلہ فاطمہ، فلاح الدین فلاحی، محمد وزیر عالم اور نرگس اسلام اور کمپیوٹر اسٹیشن انچارج پرش رام کوشک کی تہہ دل سے شکرگزار ہے۔

ترتیب

پیش لفظ			iii
اس کتاب کے بارے میں			v
1. ماں کا خواب	(نظم)	علاّمہ اقبال	1
2. ایک مزے دار کہانی	(کہانی)	مرزا فرحت اللہ بیگ	6
3. نہ ہوئی قرولی		رتن ناتھ سرشار	16
4. لو پھر بسنت آئی	(نظم)	حفیظ جالندھری	24
5. ہاکی اور ہاکی کا جادوگر		ادارہ	29
6. گُلِ عبّاس	(کہانی)	غلام عباس	35
7. دیوالی کے دیپ جلے	(نظم)	رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری	42
8. چچا کبابی دِلّی والے	(انشائیہ)	ملاّ واحدی	46
9. کندن لال سہگل		شرددت	53
10. شبنم	(نظم)	روش صدیقی	62
11. ابنِ انشا جرمنی میں	(سفرنامہ)	ابن انشا	66
12. جی آیا صاحب	(کہانی)	سعادت حسن منٹو	73
13. خوابِ آزادی	(نظم)	شوکت تھانوی	86
14. حضرت محل		مرزا کوکب قدر	91
15. وطن کی طرف واپسی		مہاتما گاندھی	99

16. فلسطینی بچے کے لیے لوری	(نظم)	فیض احمد فیض	106
17. رفیع احمد قدوائی		عبدالماجد دریابادی	111
18. قرۃ العین حیدر		ادارہ	117
19. یہ ہے میرا ہندستان	(گیت)	زبیر رضوی	123
20. بچے	(انشائیہ)	پطرس بخاری	129
21. لالچ	(کہانی)	رام آسراراز	135
22. مہمان	(ڈراما)	ممتاز مفتی	145

ماں کا خواب

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب
بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں
اندھیرا ہے اور راہ مِلتی نہیں
لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال
قدم کا تھا دہشت سے اُٹھنا محال
جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی
تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی

زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے
دیے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے

وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں
خدا جانے جانا تھا اُن کو کہاں

اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر
مجھے اس جماعت میں آیا نظر

وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا
دِیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا

کہا میں نے پہچان کر میری جاں
مجھے چھوڑ کر آگئے تم کہاں

جدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار
پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار

نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی
گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی

جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب
دیا اس نے منھ پھیر کر یوں جواب

رُلاتی ہے تجھ کو جُدائی مری
نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چُپ رہا
دِیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا

سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اِسے
ترے آنسوؤں نے بُجھایا اِسے

(علّامہ اقبال)

معنی یاد کیجیے

شب	:	رات
اضطراب	:	بے چینی
لرزنا	:	کانپنا
راہ	:	راستہ
سیاہی	:	کالاپن، اندھیرا

دہشت	:	خوف، ڈر
محال	:	مشکل
حوصلہ	:	ہمّت
زمرّد	:	سبز رنگ کے قیمتی پتھر کا نام
رواں	:	چلتے ہوئے
زمرّدی پوشاک	:	ہرا لباس
پسر	:	بیٹا
جماعت	:	گروہ
پیچ و تاب کھانا (محاورہ)	:	دل ہی دل میں غم و غصّہ سے گھُٹنا، بیقرار ہونا

سوچیے اور بتایئے۔

1. خواب میں ماں نے اپنے آپ کو کس حال میں دیکھا؟
2. ماں نے آگے بڑھ کر کیا دیکھا؟
3. ماں نے اپنے بیٹے کو کس حال میں پایا؟
4. ماں کی بے قراری کا سبب کیا ہے؟
5. لڑکے کے ہاتھ میں دیا کیوں نہیں جل رہا تھا؟

مصرعے مکمل کیجیے۔

میں سوئی جو .... یہ خواب
بڑھا اور .... مرا اضطراب
سمجھتی ہے تو .... کیا اِسے
.... نے بجھایا اِسے

نیچے لکھے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

اضطراب　　محال　　اجل　　پیچ و تاب

ان لفظوں کے متضاد لکھیے۔

وفا　　بھلائی　　جدائی　　بے قرار　　دُور　　جواب

عملی کام

- نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔
- اس نظم کو اپنے اسکول کے اسٹیج پر ڈرامے کی صورت میں پیش کیجیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

- ماننے والا　　○ بنانے والا　　○ دیکھنے والا

یہ الفاظ کسی کام کرنے والے کو ظاہر کرتے ہیں۔ انھیں اسمِ فاعل کہتے ہیں۔ پانچ اسمِ فاعل ''والا'' کے ساتھ بنائیے۔

غور کرنے کی بات

- اس نظم میں ایک ماں کا خواب بیان کیا گیا ہے جو اپنے بیٹے کو لڑکوں کی ایسی جماعت کے ساتھ دیکھتی ہے جن کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے دیے ہیں مگر اس کے بیٹے کا دِیا بجھا ہوا ہے اور وہ دوسرے لڑکوں کے پیچھے آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ یہ دیکھ کر بیٹے کی جدائی میں روتی ہوئی ماں کو صدمہ پہنچتا ہے وہ بچّے سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر کیوں چلا آیا اور اس کا دِیا بجھا ہوا کیوں ہے، بچّہ جو ماں کے رونے دھونے سے خود بھی غمگین ہے۔ ماں سے کہتا ہے کہ میرے دیے کو اسی کے آنسوؤں نے بجھایا ہے۔
- اس سبق میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ ماں باپ کے رونے دھونے سے بچّوں کا حوصلہ پست ہوتا ہے اور انھیں آگے بڑھنے میں رکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔

ایک مزے دار کہانی

ایک بُڑھیا جنگل بیابان میں جہاں نہ آدم نہ آدم زاد، ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ انھیں دنوں جاڑا، گرمی اور برسات میں جھگڑا ہوا۔ جاڑا کہتا میں اچھا، گرمی کہتی میں اچھّی، برسات کہتی میں اچھّی۔ آخر یہ صلاح ہوئی کہ چلو، چل کر کسی آدم زاد سے پوچھیں۔ ان کا جو اِدھر گزر ہوا تینوں نے کہا: ''لو بھئی وہ سامنے ایک بُڑھیا بیٹھی ہے چلو اس سے پوچھیں۔''

سب سے پہلے میاں جاڑے آئے۔ گوری گوری رنگت، کِلّے ایسے جیسے انار کا دانہ۔ سفید لمبی ڈاڑھی، موٹا سا روئی کا دگلہ پہنے، خوب اوڑھے لپٹے آئے۔ ان کا آنا تھا کہ بڑی بی کو تھرتھری چھوٹ گئی۔ میاں جاڑے نے آکر کہا: ''بڑی بی سلام''۔ بڑی بی نے کہا: ''جیتے رہو، بال بچے خوش رہیں، مگر بیٹا ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے رہو۔ مجھے تو تمھارے آنے سے کپکپی لگ رہی ہے۔'' خیر میاں جاڑے ذرا ہٹ کر کھڑے ہوئے اور کہا: ''بڑی بی ایک بات

پوچھوں؟'' بڑی بی نے کہا: ''ہاں بیٹا ضرور پوچھو۔'' میاں جاڑے نے کہا: ''بڑی بی جاڑا کیسا؟''

بڑی بی نے کہا: ''بیٹا! جاڑے کا کیا کہنا۔ سُبحان اللہ! مہاوٹ برس رہی ہے۔ دالانوں کے پردے پڑے ہیں۔ انگیٹھیاں سلگ رہی ہیں، لحافوں میں دبکے پڑے ہیں۔ چائے بن رہی ہے۔ خود پی رہے ہیں، دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ صبح ہوئی اور چنے والا آیا، گرم گرم چنے لیے۔ طرح طرح کے میوے آرہے ہیں۔ سب مزے لے لے کر کھا رہے ہیں۔ حلوہ سوہن بن رہا ہے۔ باجرے کا ملیدہ بن رہا ہے۔ رس کی کھیر پک رہی ہے۔ اِدھر کھایا اُدھر ہضم۔ خون چلّو وَں بڑھ رہا ہے۔ چہرے سُرخ ہو رہے ہیں۔ بیٹا جاڑا، جاڑے کا کیا کہنا، سُبحان اللہ!''

میاں جاڑے تھے کہ اپنی تعریفیں سُن سُن کر پھولے نہ سماتے تھے۔ جب بڑی بی چپکی ہوئیں تو میاں جاڑے نے کہا: ''بڑی بی، خدا تم کو زندہ رکھے، تم نے میرا دل خوش کر دیا۔ یہ لو ایک ہزار اشرفی کی تھیلی۔ خرچ ہو جائے تو اگلے جاڑے میں مجھ سے اور آ کر لے جانا۔''

میاں جاڑے ہٹے اور گرمی مٹکتی ہوئی سامنے آئیں۔ روشن آنکھیں، لمبی کالی چوٹی، گلے میں موتیوں کا کنٹھا، ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں جس میں کرن ٹکی ہوئی۔ ہرے ڈورے کی پیازی اوڑھنی۔ غرض بڑے ٹھسّے سے آئیں اور آتے ہی کہا:

''نانی جان سلام!''

''میں یہ پوچھنے آئی ہوں کہ نانی جان گرمی کیسی؟''

بڑی بی نے کہا: ''بیٹا گرمی، گرمی کا کیا کہنا۔ سُبحان اللہ! دن کا وقت ہے۔ خس خانوں میں پڑے ہیں۔ پنکھے جھلے جا رہے ہیں۔ برف کی قُلفیاں کھائی جا رہی ہیں۔ فصل کے میوے آ رہے ہیں۔ تِلی تِلی ککڑیاں ہیں۔ شام کو اُٹھے، نہائے دھوئے، سفید کپڑے پہنے، خَس کا عطر ملا۔ صحن میں چھڑکاؤ ہو گیا ہے۔ گھڑونچیوں پر کورے کورے مٹکے رکھے ہیں۔ رات ہوئی کوٹھوں پر پلنگ بچھ گئے۔ بیٹا! گرمی کا کیا کہنا۔ سُبحان اللہ!''

بی گرمی کا یہ حال تھا کہ تعریفیں سنتی جاتی تھیں اور نہال ہوتی جاتی تھیں۔ جب بڑی بی تعریف کرتے کرتے

تھک کر چپ ہوگئیں تو بی گرمی نے چپکے سے نکال کر ایک ہزار اشرفی کی تھیلی ان کے ہاتھ میں دی اور کہا کہ: ''نانی جان! خدا تمھارا بھلا کرے۔ تم نے آج میری لاج رکھ لی۔ میں ہر سال آیا کرتی ہوں۔ جب آؤں جو لینا ہو مجھ سے بے کھٹکے لے لیا کیجیے۔ بھلا آپ جیسے چاہنے والے مجھے ملتے کہاں ہیں۔''

بی گرمی ذرا ہٹی تھیں کہ برسات خانم چھم چھم کرتی پہنچیں۔ سانولا نمکین چہرہ، چمکدار روشن آنکھیں، بھورے بال۔ اُن میں سے پانی کی باریک باریک بوندیں اِس طرح ٹپک رہی تھیں جیسے موتی۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں۔ غرض ان کے آتے ہی برکھا رُت چھا گئی۔ انھوں نے بڑھ کر کہا: ''امّاں جان سلام!'' بڑی بی نے کہا: ''بیٹی! جیتی رہو۔ ہو نہ ہو تم بی گرمی کی بہن برسات خانم ہو؟'' بی برسات نے کہا: ''جی ہاں! میں بھی پوچھنے آئی ہوں کہ میں کیسی ہوں؟''

بڑی بی نے کہا: ''بی برسات تمھارا کیا کہنا! تم نہ ہو تو لوگ جئیں ہی کیسے؟ مینھ چھم چھم برس رہا ہے۔ باغوں میں کھم گڑے ہیں۔ جھولے پڑے ہیں۔ عورتیں ہیں کہ ہاتھوں میں مہندی رچی ہے۔ سُرخ سُرخ جوڑے، دھانی چوڑیاں پہنے جھول رہی ہیں۔ کچھ جھول رہی ہیں، کچھ جھلا رہی ہیں۔ ملہار گائے جا رہے ہیں۔ اؤدی اؤدی گھٹائیں آئی ہوئی ہیں۔ برسات! بھئی برسات کا کیا کہنا۔ سُبحان اللہ!

بی برسات نے بھی ایک ہزار کی تھیلی بڑی بی کی نذر کی اور رخصت ہوئیں۔ شام ہو چلی تھی۔ بڑی بی تھیلیاں سمیٹ سماٹ خوشی خوشی گھر آ گئیں۔ گھر میں بہار آ گئی۔

پڑوس میں ہی ایک اور بڑھیا رہتی تھی۔ اُس نے بڑی بی کے گھر جو یہ چہل پہل دیکھی تو اس سے نہ رہا گیا۔ پوچھا: ''یہ روپیہ تم کہاں سے لائیں؟'' بڑی بی نے کہا: ''مجھ کو یہ روپیہ جاڑے، گرمی اور برسات نے دیا ہے۔''

پڑوسن بڑھیا آفت کی پڑیا تھی۔ ایک دن گھر والوں سے لڑ جھگڑ کر جنگل میں جا بیٹھی۔ خدا کا کرنا تھا کہ جاڑا، گرمی، برسات اُسی دن پھر ملے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا: ''کہو بھئی، بڑھیا نے کیا تصفیہ کیا؟'' جاڑے نے

کہا: ''بھئی وہ بڑھیا غضب کی تھی۔ یہ نہیں بتایا کہ تینوں میں کون اچھّا ہے۔ سب ہی کی تعریفیں کر کے مفت میں تین ہزار اشرفیاں مار لیں۔'' غرض تینوں جلے بھُنے آگے بڑھے۔ دیکھا کہ ایک بڑھیا بیٹھی رو رہی ہے۔ پہلے میاں جاڑے پہنچے۔ ان کا آنا تھا کہ بڑھیا سردی سے تھر تھر کانپنے لگی۔

جاڑے نے کہا: ''بڑی بی سلام! مزاج تو اچھّا ہے۔ بڑھیا بولی: ''چل بڈّھے! پرے ہٹ۔ بڑی بی ہوگی تیری ماں۔ اب جاتا ہے یا نہیں۔'' میاں جاڑے نے کہا: ''بڑی بی، میں جاڑا ہوں۔ سچ بتانا میں کیسا ہوں؟''

بڑی بی نے کہا: ''اس بڑھاپے میں بھی آپ اپنی تعریف چاہتے ہیں؟ لو اپنی تعریف سُنو! آپ آئے اس کو فالج ہوا، اُس کو لقوہ ہوا۔ ہاتھ پاؤں پھٹے جا رہے ہیں۔ ناک سُڑ سُڑ بہہ رہی ہے۔ دانت ہیں کہ کٹر کٹر بج رہے ہیں۔ کپڑے اِدھر پہنے اُدھر میلے ہوئے۔ لحاف ذرا کھُلا اور ہوا سر سے گھُسی۔ بچھونے برف ہو رہے ہیں۔ توبہ توبہ!

آگ کی بھی تو گرمی جاتی رہتی ہے۔ لیجیے اپنی تعریف سُنی یا کچھ اور سُناؤں؟''

جاڑا جلا ہوا تو پہلے سے ہی تھا۔ اب جو بڑھیا کی جلی کٹی باتیں سُنیں تو جل کر کوئلہ ہو گیا۔ اپنی ٹھوڑی پکڑ کر ڈاڑھی کی جو ہوا دی تو بڑھیا کو لقوہ ہو گیا۔ چلتے چلتے دو تین ٹھوکریں رسید کیں۔ ذرا فاصلے پر بی گرمی اور برسات کھڑی تھیں ان سے کہا: ''لو جاؤ! بڑھیا سے اپنا تصفیہ کرالاؤ، ہم تو ہار گئے۔''

بی گرمی خوشی خوشی بڑھیا کے پاس آئیں اور کہا: ''نانی امّاں! میں ہوں گرمی۔ تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ گرمی کیسی؟''

یہ سُننا تھا کہ بڑھیا کے تو آگ ہی لگ گئی۔ گرمی، گرمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ! واہ واہ!! پسینہ بہہ رہا ہے۔ کپڑوں سے بوٗ آ رہی ہے۔ صبح کو کپڑے بدلے شام تک چکٹ ہو گئے۔ کھانا کھایا، کسی طرح ہضم نہیں ہوتا۔ سینے پر رکھا ہوا ہے۔ صبح ہوئی اور لوٗ چلنی شروع ہوئی۔ اِس کو لوٗ لگی، اُس کو لوٗ لگی۔ اس کو ہیضہ ہوا۔ مُنہ جھُلسا جاتا ہے۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی ہے۔ پانی پیتے پیتے جی بیزار ہو جاتا ہے۔ تمھاری جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ چل دور ہو میرے سامنے سے۔ نہیں تو ایسی بے نُقط سناؤں گی کہ تمام عمر یاد رکھے گی۔''

بی گرمی تو آگ بگولہ ہو گئیں۔ کہا: ''ٹھہر بڑھیا تجھے اس بدزبانی کا مزہ چکھاتی ہوں۔ مجھے تو کیا سمجھتی ہے۔'' یہ کہہ کر جو پھونک ماری تو ایسا معلوم ہوا کہ لوٗ لگ گئی۔ بڑھیا تو ہائے گرمی، ہائے گرمی کرتی رہی۔ بی گرمی پیٹھ پر ایک دوہتّھڑ مار چلتی بنیں۔

جب ان کو بھی روکھی صورت بنائے آتے دیکھا تو بی برسات دل میں بہت خوش ہوئیں اور سمجھیں کہ چلو میں نے پالا مار لیا۔ بڑی مٹکتی مٹکاتی بڑھیا کے پاس گئیں اور کہا: ''میں برسات ہوں۔ اچّھا بتاؤ تو برسات کیسی؟''

بڑھیا نے کہا: ''برسات سے خدا بچائے۔ بجلی چمک رہی ہے۔ بادل گرج رہے ہیں۔ کلیجہ ہلا جاتا ہے۔ دھما دھم کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ذرا پاؤں باہر رکھا اور چھینٹے سر سے اوپر ہو گئے۔ ذرا تیز چلے اور جوتیاں کیچڑ میں پھنس کر رہ گئیں۔ رات کو مچھّر ہیں کہ ستائے جا رہے ہیں۔ نہ رات کو نیند، نہ دن کو چین اور پھر اس پر بھی یہ سوال کہ نانی

جان میں کیسی ہوں۔ نانی جان سے تعریف سُن لی؟ اب تو دل ٹھنڈا ہو گیا۔ اے ہے! یہ بے موسم کی گرمی کیسی؟ خدا خیر کرے۔'' بڑھیا یہ کہہ رہی تھی کہ بی برسات کی نگاہ بجلی بن کر گری اور بڑی بی کے پاؤں کو چاٹتی ہوئی نکل گئی اور بی برسات بڑھیا کو لنگڑا کر، مُنہ پر تھوک کر رخصت ہوئیں۔

بات یہ ہے کہ اللہ شکّر خورے کو شکّر ہی دیتا ہے۔ جو لوگ خوش مزاج ہوتے ہیں وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور موئے رونی صورت تو ہمیشہ جوتیاں کھاتے ہیں۔

(مرزا فرحت اللہ بیگ)

معنی یاد کیجیے

بیابان	:	جنگل
آدم نہ آدم زاد	:	جہاں کسی انسان یا جاندار کا نام ونشان نہ ہو
صلاح	:	مشورہ، رائے
کلّے	:	درخت کی وہ کونپل جو کلی کی طرح پھوٹتی ہے
دگلہ	:	روئی دار لبادہ، سردی کا ایک لباس
سبحان اللہ	:	پاک ذات ہے اللہ کی، شکر گزاری کے اظہار کے لیے کہا جاتا ہے
مہاوٹ	:	جاڑے کی بارش
ملیدہ	:	(مالیدہ) نمک، گڑ یا شکر اور روٹی کو خوب مل کر تیار کی جانے والی ایک غذا
کنٹھا	:	پھولوں کا ہار، موٹے موٹے موتیوں کی مالا
خس	:	ایک قسم کی گھاس
گھڑونچی	:	گھڑے رکھنے کا اسٹینڈ جو بالعموم لکڑی کا ہوتا ہے
نہال ہونا (محاورہ)	:	بہت خوش ہونا، سرشار ہونا
آفت کی پڑیا	:	بہت زیادہ تیز، چالاک

لاج رکھنا (محاورہ)	:	شرم رکھنا، عزت آبرو کا خیال رکھنا
ملہار گانا (محاورہ)	:	برسات کے موسم کا گیت
نذر کرنا	:	پیش کرنا، بھینٹ دینا
تصفیہ	:	فیصلہ
فالج	:	ایک ایسی بیماری جس میں جسم کا کوئی حصّہ بے حس ہو جاتا ہے
آگ لگنا (محاورہ)	:	بہت زیادہ غصہ ہونا
لقوہ	:	ایک ایسی بیماری جس سے منہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے
آگ بگولہ ہونا (محاورہ)	:	بہت غصّہ میں ہونا
کلیجہ دہلنا (محاورہ)	:	بہت زیادہ خوف کھانا

سوچیے اور بتایئے۔

1. جاڑا، گرمی اور برسات کا آپس میں جھگڑا کیوں ہوا؟
2. جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے انھوں نے کیا کیا؟
3. جاڑے کی کن خوبیوں کو بڑی بی نے بیان کیا؟
4. گرمی کے بارے میں بڑی بی کا کیا خیال تھا؟
5. مصنف نے برسات کا کیا حُلیہ بتایا؟
6. بڑی بی کو نذر میں تھیلیاں کیوں ملیں؟
7. بڑی بی کے گھر میں چہل پہل سے پڑوسن پر کیا اثر ہوا؟
8. بدزبان بڑھیا جاڑے کے ساتھ کس طرح پیش آئی؟
9. برسات کی کون سی باتوں کو بڑھیا نے ناپسند کیا؟
10. بڑھیا کے ساتھ برسات کا سلوک کیسا تھا؟

خالی جگہ کو صحیح لفظ سے بھریے۔

1. اُنھیں دنوں ....اور برسات میں جھگڑا ہوا۔
2. باجرے کا.............بن رہا ہے، رس کی ....پک رہی ہے۔
3. میاں جاڑے اپنی تعریفیں سن سن کر ....نہ سماتے تھے۔
4. نانی جان ! خدا تمھارا بھلا کرے تم نے آج ....رکھ لی۔
5. ....برس رہا ہے۔

نیچے لکھے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

صلاح تصفیہ بیاباں آدم نہ آدم زاد ملہار

نیچے لکھے ہوئے واحد اور جمع کو الگ الگ کر کے لکھیے۔

بچے تعریف اشرفی قلفیاں چوڑیاں گھٹا مہاوٹ فاصلہ

محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

محاورے		معنی
تھرتھر کانپنا	:	بہت زیادہ ڈرنا، ڈر جانا
پھولے نہ سمانا	:	بہت خوش ہونا
نہال ہونا	:	بہت خوش ہونا، سرشار ہونا
جی بیزار ہونا	:	اکتا جانا
آگ بگولہ ہونا	:	بہت زیادہ غصّہ ہونا

کلیجہ دہلنا : بہت زیادہ خوف کھانا

پاؤں چاٹنا : چاپلوسی کرنا

عملی کام

- ہندستانی موسم، جاڑا، گرمی اور برسات کی خوبیاں بیان کیجیے۔
- ملیدہ کس موسم میں بنایا جاتا ہے۔ اپنی والدہ سے بنوا کر کھائیے۔

پڑھیے اور سمجھیے۔

سورج نکل رہا ہے

اکبر ابھی ناشتہ کر رہا ہے

اوپر کے جملوں میں خط کشیدہ الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ کام شروع تو ہوا لیکن ابھی ختم نہیں ہوا- انھیں حال ناتمام کہتے ہیں۔

چاند نکل آیا ہے

وہ اسکول جا چکی ہے

اوپر کے جملوں میں خط کشیدہ افعال سے پتہ چلتا ہے کہ کام ختم ہو چکا ہے انھیں حال تمام کہتے ہیں۔

غور کرنے کی بات

- مرزا فرحت اللہ بیگ اس کہانی کے مصنّف ہیں۔ وہ اردو کے ممتاز نثر نگار تھے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں دِلّی کی بول چال کی زبان اس خوب صورتی سے لکھتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو مزہ آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی سچ مچ ہمارے سامنے بیٹھا مزے دار کہانی سنا رہا ہو۔ انھوں نے اس کہانی میں جاڑا، گرمی اور برسات کی اچھائیوں اور برائیوں کو اپنے مخصوص دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

- ہندستان میں تین موسم ہوتے ہیں: موسم سرما، گرما اور برسات۔ اس کے علاوہ ایک اور موسم بھی کئی ملکوں میں ہوتا ہے جسے موسمِ بہار کہتے ہیں۔ ان موسموں کی اپنی اپنی خوبیاں اور کمیاں ہیں۔ ہر موسم میں اللہ تعالیٰ نے مختلف پھول، پھل اور سبزیاں انسان کے لیے پیدا کیں۔ برسات کے موسم کا خاص طور پر کسان بڑا استعمال کرتے ہیں۔ اس موسم میں کئی تہوار بھی ہوتے ہیں۔ باغوں میں جھولے پڑ جاتے ہیں۔ ملہار اور گیت گائے جاتے ہیں۔

نہ ہوئی قرولی

میاں خوجی اور آزاد کو لکھنؤ آئے کافی دن ہو چکے تھے۔ لکھنؤ کے سیر سپاٹے اور یہاں کے نوابوں کی محفلوں سے ان کے دل اوب چکے تھے۔ سرائے میں قیام تھا۔ ترکی کا سفر سوار تھا اور دونوں سفر کی تیاری میں مصروف تھے کہ ایک رات عجیب واقعہ پیش آیا۔

جیسے ہی خوجی دن بھر کے تھکے ہارے پلنگ پر دراز ہوئے، ذرا دیر میں ان کی آنکھ لگ گئی۔ آپ جانیں کہ سرائے کے کھاٹ کھٹملوں کا بسیرا۔ پچھلے پہر سے ہی کھٹملوں نے میاں خوجی کو بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔ بدن بھر کا خون جونک کی طرح پی لیا۔ جسم چھلنی کر دیا۔ ایک طرف تھکن، دوسری طرف نیند کا غلبہ اور اس پر کھٹملوں کی یورش۔ میاں خوجی جھلّا اٹھے۔ آنکھ کھل گئی۔ چراغ روشن کیا۔ دیکھا تو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں کھٹمل بستر پر رینگ رہے ہیں۔ انھیں جو دیکھا تو میاں خوجی کا پارہ چڑھ گیا۔ چہرہ بھبھوکا ہو گیا اور لگے غصے میں چیخنے چلانے۔

’’ارے لانا میری قرولی۔ لانا میری قرولی۔ ابھی ان کھٹمل گیدیوں کو موت کے گھاٹ اتارتا ہوں۔ اتنی قرولیاں بھونکوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ انھوں نے کیا سمجھا ہے۔ارے لانا میری قرولی۔ کہاں گئی میری قرولی؟‘‘ میاں خوجی نے ہانک لگائی۔ اور یوں دھاڑ دھاڑ کر چیخے تو تمام سرائے والوں کی نیند حرام ہوگئی۔ وہ یہ سمجھے کہ چور آ گیا۔ ہر طرف لینا، پکڑنا، جانے نہ پائے کا شور مچ گیا۔

ساری سرائے میں ہلڑ مچ گیا۔ ہڑبونگ کا یہ عالم کہ کوئی آنکھ ملتا اندھیرے میں ٹٹولتا ہے، کوئی دیدے پھاڑ پھاڑ کر اپنی گٹھری کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا ہے۔ کوئی کھاٹ کے نیچے سے اپنا صندوق کھینچتا ہے۔ کوئی مارے ڈر کے آنکھیں بند کیے دبکا پڑا ہے۔ کوئی لاٹھی ہاتھ میں لیے چور کے پیچھے بھاگتا ہے۔ چور۔ چور۔ لینا پکڑنا۔ جانے نہ پائے۔ جاگتے رہنا کے شور سے کہرام مچ گیا۔

میاں خوجی نے جو لینا، پکڑنا، جانے نہ پائے جاگتے رہنا۔ چور۔ چور کی آوازیں سنیں تو خود بھی غل مچانے لگے۔

’’ہائیں ہائیں! خبردار۔ جانے نہ پائے لانا میری قرولی۔ اے چور گیدی۔ ٹھہرے رہنا۔ میں ابھی قرولی لے کر آتا ہوں۔‘‘

اب میاں خوجی کو یہ کون بتائے کہ یہ شگوفہ خود ان کا ہی چھوڑا ہوا ہے۔ نہ وہ سوتے نہ کھٹمل کاٹتے نہ وہ چیختے چلاّتے اور نہ کھٹمل کا چور بنتا۔ بات کا بتنگڑ تو خود انھوں نے ہی بنایا تھا۔

اب میاں خوجی کی رگ بہادری پھڑک اٹھی، ایک دم سے کنڈی کھول کر چور پر لپک پڑے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ گلا پھاڑ کر چیخنے چلانے لگے۔ لینا۔ لینا۔ لینا جانے نہ پائے‘‘۔ اور ایک طرف کو جدھر سے زیادہ آوازیں آ رہی تھیں، تیزی سے بڑھے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ کسی چیز سے ٹکرائے اور ٹھوکر کھائی اور اڑ اڑا دھم اوندھے منہ زمین پر آ رہے۔ بدقسمتی سے وہاں کمہار کے برتن رکھے تھے۔ ان پر جو گرے تو برتن چکنا چور ہو گئے۔ جسم سے خون رسنے لگا۔

کمہار نے جو دیکھا کہ کوئی برتنوں پر سے کود کر بھاگ رہا ہے تو اس نے بھی چیخنا شروع کر دیا۔

’’چور چور، پکڑو، پکڑو، جانے نہ پائے۔‘‘

یہ سن کر خوجی برتنوں پر پڑے پڑے خود بھی چیخنے لگے۔’’چور چور نہ ہوئی قرولی ورنہ.........‘‘

مسافر بھٹیارے، حوالی موالی کوئی ڈنڈا لیے ہے، کوئی بید گھماتا ہے، کوئی لکڑی ہلاتا ہے اور میاں خوجی ٹوٹے ہوئے برتنوں پر بے دم پڑے آوازیں لگا رہے ہیں۔‘‘

’’نہ ہوئی قرولی ورنہ........‘‘

کمہار نے جو دیکھا کہ ایک آدمی پڑا ہے تو سمجھا کہ یہی چور ہے آگے بڑھ کر گلا پکڑا۔ جھٹکے سے زمین سے کھینچا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔ اور زور زور سے چلّانے لگا۔

’’ارے دوڑو۔ چور پکڑ لیا۔ چور پکڑ لیا۔‘‘

آنے والوں نے خوجی کو چور سمجھ کر ایسی خاطر تواضع کی، اتنا مارا کوٹا، اتنا ٹھونکا بجایا۔ اتنے لات گھونسے رسید کیے کہ میاں کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔

اندھیری رات تھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ چور ہے یا میاں خوجی۔ لوگوں کو تو شکار ہاتھ آ گیا تھا۔ میاں خوجی چور بن گئے اور بے بھاؤ کے سہتے رہے۔ یار لوگوں نے تاک تاک کر زناٹے کے ہاتھ لگائے۔

جب لوگ مار مار کر تھک گئے تو مسافروں میں سے کسی نے کہا۔

''اے ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ یہ تو وہی خوجی ہے جو پانچ سات روز سے اس سرائے میں ڈیرہ جمائے ہے۔ فوراً چراغ جلایا گیا، لوگوں نے پہچانا تو دیکھا کہ یہ تو وہی تیرھویں صدی کا بالشتیا خوجی ہے۔ سب نے ایک زبان ہو کر کمہار سے کہا۔

''چھوڑ دے۔ چھوڑ دے۔ چور نہیں ہے، خوجی ہے۔ برتنوں کے دام ہم دیں گے۔''

اللہ اللہ کر کے میاں خوجی کی جان بچی۔ کچومر تو نکل ہی چکا تھا۔ بے دم ہو چکے تھے۔ جیسے ہی کمہار نے انھیں چھوڑا ان کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی زمین پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے۔ ''ارے کمہار گیدی ہٹتا ہے یا ماروں قرولی۔''

یار لوگوں نے جب خوجی کی حالت غیر دیکھی تو کوئی جسم دبانے لگا۔ کسی نے سر سہلایا۔ کسی نے سہارا دیا اور میاں خوجی ذرا سی دیر میں گرد جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

ادھر آزاد کو خبر ملی کہ خوجی چوری کرتے پکڑے گئے ہیں۔ کسی مسافر کی ٹوپی چرالی تھی۔ کسی نے آزاد کو بتایا کہ کمہار کی ہنڈیا چرانے گئے تھے۔ جاگ پڑ گئی۔ پکڑے گئے۔ بے بھاؤ کی پڑیں۔ غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

آزاد کو بہت صدمہ ہوا کہ ان کا ساتھی اور چوری کی عِلّت میں گرفتار ہو۔ مگر یہ بات ان کے دل کو نہیں لگتی تھی، انھیں یقین نہیں آتا تھا۔ بھلا ان کا یار خوجی ایسا کرے وہ چوری چکاری کیا جانے؟ وہ تو بس فقرہ بازی جانتا ہے، شیخی بگھارتا ہے اور دون کی لیتا ہے۔ بھلا چوری چکاری بھی کرتا تو کمہار کی ہنڈیوں کی؟

آزاد کو غصہ آ گیا۔ جلدی سے چار پائی سے اترے اور لکڑی ہاتھ میں لی کہ جو بولے گا اس کو مزہ چکھا دوں گا۔ اور خوجی کی مزاج پرسی کو چلا۔

ابھی آزاد اپنی کوٹھری سے باہر نکلے ہی تھے کہ ان کے کان میں آواز آئی۔

''ہات تیرے گیدی کی۔ بڑا آزاد بنا پھرتا ہے۔ ایسے آزاد بہت دیکھے ہیں۔ مردود چار پائی پر پڑا خرخر کیا کیا اور ہماری خبر نہ لی۔''

یہ سن کر آزاد مسکرائے۔ ابھی دو قدم چلے ہوں گے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ خوجی جھومتا جھامتا چلا آتا ہے اور بڑبڑاتا جاتا ہے۔''

''نہ ہوئی قرولی ورنہ اس وقت کمہار کی لاش پھڑکتی ہوتی۔''

خوجی لڑکھڑاتا۔ جھومتا جھامتا آزاد کی کوٹھری تک چلا آیا۔ مگر آنکھوں کا اندھا نام نین سُکھ، اتنا بھی نہ سوجھا کہ آزاد کھڑا ہے۔ جب قریب پہنچا تو آزاد نے کہا۔

''خیر ہم کو تو پیچھے گالیاں دینا۔ اب یہ بتاؤ کہ ہاتھ پیر تو نہیں ٹوٹے۔''

''ہاتھ پاؤں۔'' خوجی بولا۔ ''ہونہہ۔ یہ لوہے کی سلاخیں ہیں۔ پچاس آدمی گھیرے ہوئے تھے۔ پورے پچاس۔ وہ وہ ہاتھ دکھائے کہ سب دنگ رہ گئے چٹکیوں میں گھیرا توڑ، لوگوں کو بکھیر کر رکھ دیا۔ نہ ہوئی قرولی اس وقت قسم امیر علیہ السلام کی چار پانچ لاشیں پھڑک رہی ہوتیں۔

آزاد مزاج داں تھے۔ مسکرا کر کہا۔ ''وہ کیسے؟''

خوجی نے فوراً ہاتھ پھینک کر کہا۔ ''واللہ! میں اس وقت پھلجھڑی بنا ہوا تھا۔ بس کیفیت یہ تھی کہ دس آدمی اس کندھے تو دس آدمی اس کندھے۔ میں جو پھرا تو کسی کو انٹی دی۔ وہ دھم سے زمین پر گرا۔ کسی کو کولہے پر لاد کر مارا۔ کھٹ سے چھپر کھٹ کی پٹی پر۔ دو چار تو میرے رعب میں آ کر ہی گر پڑے۔ دس بارہ کی ہڈی پسلی ایک کر دی۔ جو میرے سامنے آیا اسے نیچا دکھایا۔ مار مار کے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ اور وہ کمہار گیدی تو ساری عمر یاد رکھے گا کہ کس سے واسطہ پڑا تھا۔''

آزاد نے بہت غور سے یہ سب کچھ سنا اور کہا۔ ''درست فرمایا آپ کی ذاتِ شریف سے یہی توقع تھی۔ مرداں چنیں کنند۔'' (یعنی بہادر ایسا ہی کرتے ہیں)

''اچھا اب آپ کچھ دیر آرام کیجیے صبح سویرے نواب صاحب کے ہاں حاضری دینا ہے کہ رسمِ دُنیا ہے، ان سے رخصت بھی ہو لیں گے۔''

خوجی یہ سن کر جھوم اٹھے اور کہا۔ ''واللہ آزاد! تم بھی عالم میں انتخاب ہو لیکن یہ ترکی کا سفر اور وہ بھی بحری راستے سے ذرا خطرناک ہے۔ خیر کچھ دیر آرام کر لو شب بخیر۔ شب بخیر۔''

(پنڈت رتن ناتھ سرشار کے
''فسانۂ آزاد'' سے ماخوذ)

معنی یاد کیجیے

عجیب	:	انوکھی
یورش	:	حملہ، چڑھائی
بسیرا	:	سرائے، ٹھہرنے کی جگہ
غلبہ	:	چھا جانا
ہڑبونگ	:	اُدھم بازی، فتنہ پرواز
حوالی موالی	:	خوشامدی، ساتھ رہنے والے
خاطر تواضع	:	کھلانا پلانا، یہاں بطور طنز پٹائی مراد ہے
حمیت	:	غیرت
صدمہ	:	دُکھ
قرولی	:	شکاری کا چاقو، (ایک خاص طرح کا چاقو جو مڑا ہوا ہوتا ہے)

سوچیے اور بتایئے۔

1. میاں خوجی کس کے ساتھ اور کہاں آئے ہوئے تھے؟
2. خوجی جہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں کیا حادثہ پیش آیا؟
3. سرائے میں کہرام کیوں مچ گیا؟

4. میاں خوجی کے ساتھ لوگوں نے کیا سلوک کیا؟
5. ''رگِ حمیت پھڑک اٹھی''اس کی وضاحت کیجیے۔
6. خوجی کا دوست کون تھا؟
7. خوجی آزاد کی کون سی بات سن کر جھوم اٹھے؟

نیچے لکھے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

فائدہ مند   بیزاری   صدمہ   قرولی   بسیرا

نیچے لکھے ہوئے مذکر الگ کیجیے۔

سرائے   کمہار   زمین   مٹکا   کتاب   پیالی   آدم   برتن
حوّا   خوشی   موتی   قرولی   انڈا

عملی کام

- منصب دار ایک مرکب لفظ ہے جس کے معنی ہیں۔''عہدے دار''اس طرح لفظوں کے آگے دار لگا کر پانچ نئے الفاظ بنائیے۔
- ''خوش مذاق''خوش اور مذاق سے مل کر بنا ہے جس کے معنی ہیں اچھا ذوق رکھنے والا۔ یہ صفت ہے۔اسی طرح خوش کے ساتھ دل، مزاج، رنگ اور بخت ملا کر صفت بنائیے۔
- خوجی کا کردار آپ کو کیسا لگا؟ اس کے بارے میں اپنی رائے لکھیے۔

پڑھیے اور سمجھیے۔

محاورے	معنی
جان پر آ بننا	جان کا خطرے میں پڑ جانا

موت کے گھاٹ اتارنا	جان سے مار دینا، ختم کر دینا
مرغ کی ایک ٹانگ (کہاوت)	اپنی بات پر رہنا
بات کا بتنگڑ بنانا	چھوٹی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا
پالا نہ پڑنا	مقابلہ نہ ہونا

اس سبق میں محاورے اور کہاوتیں استعمال ہوئی ہیں۔ عام بول چال میں شامل ایسے فقرے جو اپنے اصل معنی کے بجائے مختلف معنی میں استعمال ہوتے ہیں، انھیں محاورہ کہتے ہیں۔ عام بول چال کے چند جملے جو اپنے لفظی معنی سے ہٹ کر کچھ اور معنی ادا کرتے ہیں انھیں کہاوتیں کہتے ہیں۔ محاوروں کی طرح کہاوتوں میں بھی کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔

اوپر دیے گئے محاوروں اور کہاوت کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

غور کرنے کی بات

- ''نہ ہوئی قرولی'' پنڈت رتن ناتھ سرشار کے مشہور ناول ''فسانۂ آزاد'' سے لیا گیا ہے۔ اس ناول کے کئی کردار ہیں۔ آزاد اور خوجی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ خوجی اپنی حماقتوں اور ڈینگوں کی وجہ سے نہ صرف اس کتاب کی جان ہیں بلکہ اردو ادب کے چند زندہ جاوید کرداروں میں سے ایک ہیں۔ اس سبق میں خوجی کی حماقتوں کی تصویر کشی کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ مار کھانے کے بعد کس طرح اکڑتے ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ پٹے نہیں بلکہ انھوں نے کئی لوگوں کو مار مار کر درست کر دیا ہے۔ زوال پذیر معاشرے میں ایسے کردار پیدا ہو جاتے ہیں۔ آج بھی ایسے کردار موجود ہیں۔ سرشار نے مبالغہ آمیز مزاح میں خوجی کو ایک نہایت دلچسپ کردار بنا دیا ہے۔

لو پھر بسنت آئی

لو پھر بسنت آئی
لو پھر بسنت آئی   پھولوں پہ رنگ لائی
چلو بے درنگ
لبِ آبِ گنگ
بجے جل ترنگ
من پر اُمنگ چھائی   پھولوں پہ رنگ لائی

لو پھر بسنت آئی
کھیتوں کا ہر چرندہ
کھیتوں کا ہر چرندہ　　　باغوں کا ہر پرندہ
کوئی گرم خیز
کوئی نغمہ ریز
سُبک اور تیز
پھر ہو گیا ہے زندہ　　　باغوں کا ہر پرندہ
کھیتوں کا ہر چرندہ
پھولی ہوئی ہے سرسوں
پھولی ہوئی ہے سرسوں　　　پھولی ہوئی ہے سرسوں

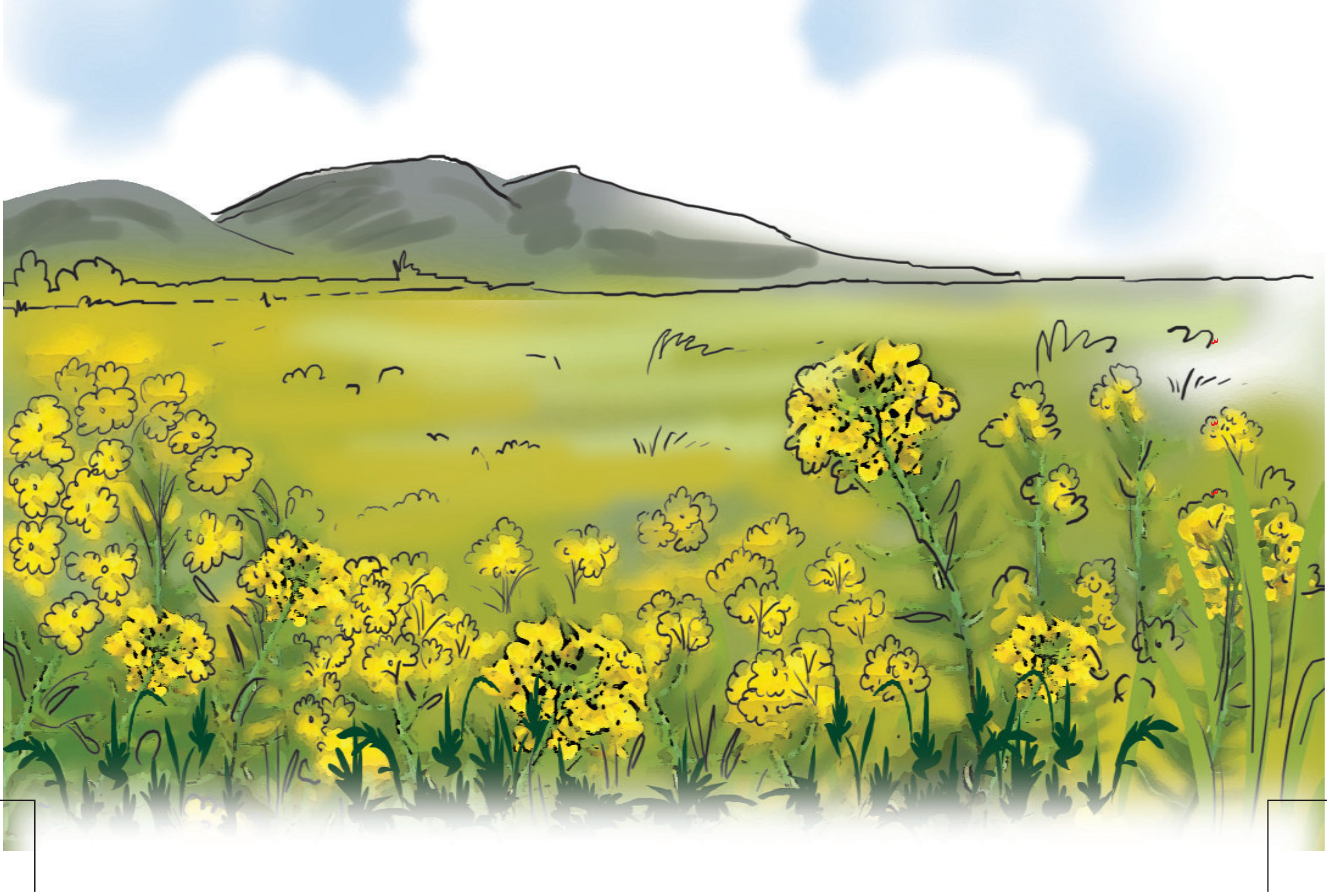

نہیں کچھ بھی یاد
یونہی بامراد
یونہی شادشاد
یونہی بامراد
یونہی شادشاد
گویا رہے گی برسوں — بھولی ہوئی ہے سرسوں
پھولی ہوئی ہے سرسوں
لو پھر بسنت آئی
لو پھر بسنت آئی — پھولوں پہ رنگ لائی

(حفیظ جالندھری)

معنی یاد کیجیے

بسنت	:	ہندستان کی چھ رُتوں میں سے پہلی رُت کا نام جو چیت سے بیساکھ تک رہتی ہے موسمِ بہار۔ وسط مارچ سے اخیر مئی تک کا موسم
درنگ	:	دیر
بے درنگ	:	بغیر دیر کیے، بلا جھجک
لبِ آبِ گنگ	:	دریائے گنگا کے کنارے
جل ترنگ	:	ایک باجے کا نام جسے پیالوں میں پانی بھر کر تیلیوں سے بجایا جاتا ہے۔ ہر پیالی میں پانی کی مقدار الگ الگ ہوتی ہے

من	:	دل، جی
امنگ	:	جوش، ولولہ
چرندہ	:	چرنے والا
گرم خیز	:	تیز چلنے والا، یہاں مراد اچھل کود کرنے والا ہے
نغمہ ریز	:	سریلی آواز میں گانے والا، چہچہانے والا
سبک	:	ہلکا، نازک، لطیف
سرسوں	:	رائی
بامراد	:	مراد پایا ہوا، جس کی مراد پوری ہوگئی ہو
شاد	:	خوش

سوچیے اور بتائیے۔

1. بسنت آنے پر لوگ گنگا کے کنارے کیوں جانا چاہتے ہیں؟
2. بسنت میں چرند اور پرند کس حال میں ہوتے ہیں؟
3. سرسوں کون سی بات بھولی ہوئی ہے؟
4. بسنت کا موسم کب آتا ہے؟

مصرعے مکمل کیجیے۔

1. کھیتوں کا ہر چرندہ باغوں کا ہر ....
2. گویا رہے کی برسوں بھولی ہوئی ہے ....

نیچے لکھے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

امنگ چرندہ سبک شاد بامراد

عملی کام

- اس نظم کو زبانی یاد کیجیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

ہال حال فضا فزا عام آم سدا صدا

اوپر دیے گئے لفظوں کے معنی اور املا مختلف ہیں۔ ایسے الفاظ جن کے معنی اور املا مختلف لیکن آواز ایک ہو وہ ''ہم آواز الفاظ'' کہلاتے ہیں۔ مطالعے کے دوران آنے والے ایسے الفاظ کی فہرست بنائیے۔

غور کرنے کی بات

- حفیظ جالندھری نے مناظرِ فطرت اور موسم پر بہت سے گیت اور نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کو ترنم سے پڑھا جائے تو ایک خاص لطف آتا ہے۔
- اس نظم میں لب اور آب کے ساتھ اضافت لگی ہوئی ہے۔ اضافت اس زیر کو کہتے ہیں جو دو لفظوں کے درمیان پہلے لفظ کے آخر میں لگایا جاتا ہے۔ غور کیجیے کہ اضافت کے استعمال کے بعد معنی کس طرح اخذ کیے جاتے ہیں۔ مثلاً آبِ گنگ'' کا پانی''۔ ''لبِ آبِ گنگ'' دریائے گنگا کے کنارے آباد ہے۔

ہاکی اور ہاکی کا جادوگر

فٹ بال، والی بال اور کرکٹ کی طرح ہاکی بھی میدانی آوٹ ڈور کھیل ہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم یونان اور ایران میں ہاکی سے ملتا جلتا ایک کھیل کھیلا جاتا تھا۔ میکسیکو میں پڑوسی قبیلے دوستانہ ماحول میں ایک دوسرے کو اس کھیل کی دعوت دیتے۔ کھیل طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک چلتا تھا۔ گول کئی کئی میل کے فاصلے پر ہوتے اور ہر ٹیم میں تقریباً ایک ہزار کھلاڑی ہوتے تھے۔ کھیل اتنے جنگلی انداز میں کھیلا جاتا کہ کبھی کبھی کھلاڑیوں کے سر پھٹ جاتے اور ہاتھ پاؤں تک ٹوٹ جاتے تھے۔

صدیوں بعد ہاکی کا کھیل فرانس میں ہاکٹ (HOQUET) کے نام سے شروع ہوا۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یہ رودبارِ انگلستان پار کر کے انگلستان (انگلینڈ) پہنچ گیا۔ وہاں اس کا نام 'ہاکی' رکھا گیا۔ انگلینڈ ہی میں اس کھیل کے ضابطے بنائے گئے۔ اسکول کے لڑکے جنگلوں سے چھڑیاں کاٹتے اور ان کو موڑ کر گیندوں سے ہاکی کھیلتے۔ ابتدا میں کھلاڑیوں کی کوئی تعداد مقرر نہ تھی۔ بعد میں ایک ٹیم کے لیے گیارہ کھلاڑیوں کی تعداد طے کر دی گئی۔ ہاکی کا میدان سو گز (91 میٹر) لمبا اور ساٹھ گز (54 میٹر) چوڑا ہوتا ہے۔ امریکہ اور کناڈا وغیرہ میں میدانی ہاکی (فیلڈ ہاکی) کے علاوہ بند اسٹیڈیم میں برف پر ہاکی (آئس ہاکی) بھی کھیلی جاتی ہے۔

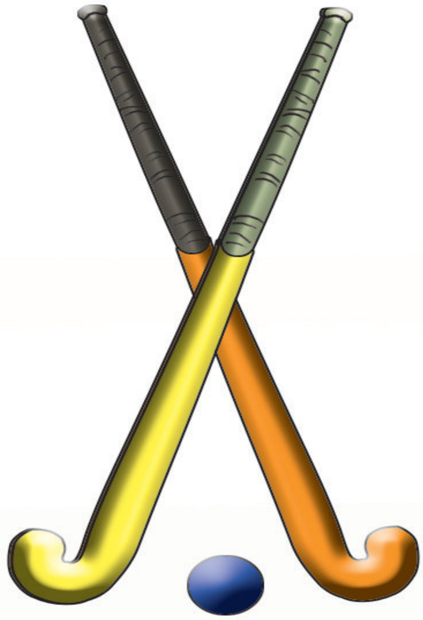

ہندوستان میں ہاکی کا کھیل انگریزوں کے ذریعے پہنچا۔ 1885 میں ملک کا پہلا ہاکی کلب کلکتہ میں قائم ہوا۔ ہندستان نے پہلی دفعہ

1928 کے اولمپک کھیلوں میں ہالینڈ کو فائنل میں ہرا کر ہاکی میں طلائی تمغہ حاصل کیا۔ اس کے بعد کے تقریباً چالیس سال تک ہندوستانی ٹیم ہاکی کے کھیل میں ساری دنیا پر چھائی رہی۔

ہندستانی ہاکی کی تاریخ میجر دھیان چند کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ وہ الہ آباد کے ایک راجپوت خاندان میں 29 اگست 1905 کو پیدا ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں فوج میں معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے اور میجر کے عہدے تک ترقی کی۔ وہ فوج کے ایک افسر کی نگرانی میں ہاکی کھیلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے ایک عظیم کھلاڑی بن گئے۔

ہندوستان کی ہاکی ٹیم نے جب پہلی بار اولمپک کھیلوں میں حصہ لیا تو فائنل میں ہندوستان اور ہالینڈ کا مقابلہ تھا۔ دھیان چند اور ٹیم کے دوسرے ساتھی اچانک بیمار ہو گئے۔ کپتان بھی اس وقت موجود نہیں تھے۔ ٹیم کے منیجر نے ''کرو یا مرو'' کا نعرہ دیا۔ دھیان چند کو تیز بخار تھا لیکن انھوں نے سوچا کہ میں تو فوجی ہوں اور ایک فوجی کو دلیری کے ساتھ جنگ میں جانا ہی چاہیے۔ چنانچہ ہندوستانی ٹیم تمام طاقت بٹور کر میدان میں کود پڑی۔

اس میچ میں ہندوستان نے ہالینڈ کو تین گول سے ہرایا، جن میں سے دو گول دھیان چند نے کیے تھے۔ 1936 کے برلن اولمپک مقابلوں میں دھیان چند کو ہندستان کی ہاکی ٹیم کا کپتان چنا گیا۔ فائنل مقابلہ ہندستان اور جرمنی کی ٹیموں کے درمیان تھا۔ یہ مقابلہ بڑا سخت ثابت ہوا۔ میچ کے درمیان گیند ہر وقت دھیان چند کی ہاکی اسٹک کے ساتھ چپکی رہتی تھی۔ گیند کو اپنے قابو میں رکھنے کے اس عجیب طریقے کو دیکھ کر تماشائی حیران رہ گئے۔ مقابلے کا انتظار کرنے والے کچھ لوگوں کو یہ شک ہونے لگا کہ کہیں دھیان چند کی اسٹک میں کوئی ایسی چیز تو نہیں لگی ہے جو گیند کو اپنی جانب کھینچے رہتی ہے۔ چنانچہ دھیان چند کو دوسری اسٹک سے کھیلنے کے لیے کہا گیا۔ دوسری اسٹک سے بھی دھیان چند نے دھڑا دھڑ گولوں کا تانتا باندھ دیا۔ اب جرمن حکام کو یقین ہو گیا کہ جادو اسٹک کا نہیں، بلکہ دھیان چند کی لچک دار اور مضبوط کلائیوں کا ہے۔ وہاں کے تماشائیوں نے اسی وقت سے دھیان چند کو 'ہاکی کا جادوگر' کہنا شروع کر دیا۔ اس اولمپک میں ہندستانی ٹیم نے کل اڑتیس 38 گول کیے جن میں سے گیارہ اکیلے دھیان چند ہی نے کیے تھے۔

ساری دنیا میں مشہور ہونے کے بعد بھی دھیان چند میں کبھی بھی غرور پیدا نہیں ہوا۔ وہ کہتے تھے: ''ہاکی کے میدان میں جو تھوڑی بہت خدمت مجھ سے ہو سکی ہے اس کا سبب ہے میرے ملک کے باشندوں کی مجھ سے محبت۔''

میجر دھیان چند نوجوان کھلاڑیوں سے ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ ذاتی شہرت یا نام کے لیے نہیں بلکہ پوری ٹیم کو یک جان ہو کر کھیلنا چاہیے، تا کہ ملک کا نام روشن ہو۔

ہاکی کے جادوگر کا انتقال دلّی میں 3 دسمبر 1979 کو ہوا۔

(ادارہ)

معنی یاد کیجیے

قدیم	:	پرانا
قبیلہ	:	مشترکہ نسلی خصوصیت رکھنے والا گروہ
طلوعِ آفتاب	:	سورج نکلنا

غروبِ آفتاب	:	سورج ڈوبنا
رودبارِ انگلستان	:	انگلش چینل (انگلینڈ اور فرانس کے درمیان کا سمندری راستہ)
ضابطہ	:	قاعدہ، قانون
مقرر	:	طے کیا ہوا
اسٹیڈیم	:	کھیل کھیلنے کا وہ میدان جس میں کھیل دیکھنے والوں کا بھی انتظام ہو
کھلبلی	:	ہلچل، شورشرابہ، ہنگامہ
فائنل	:	آخری
طلائی تمغہ	:	سونے کا میڈل
مکمل	:	پورا
میجر	:	فوجی افسر
بھرتی	:	داخل ہونا، داخلہ
منیجر	:	منتظم، مہتمم
اولمپک	:	ہر چار سال بعد ایک مرتبہ ہونے والے کھیلوں کے عالمی مقابلے
اسٹک	:	ہاکی کھیلنے کی چھڑی
جانب	:	طرف
جرمن	:	جرمنی کا رہنے والا
حکام	:	حاکموں کی جمع، افسران
شہرت	:	مشہور ہونا
نام روشن ہونا	:	عزت حاصل کرنا، شہرت پانا
گولوں کا تانتا باندھ دیا	:	لگاتار کئی گول کیے

سوچیے اور بتائیے۔

1. ہاکی کھیلنے کے لیے کتنی جگہ چاہیے؟
2. قدیم زمانے میں ہاکی جیسا کھیل کہاں کہاں کھیلا جاتا تھا؟

3. فرانس میں کھیلے جانے والے کھیل کو کیا کہتے تھے؟
4. ہاکی کے ضابطے کس ملک میں بنائے گئے؟
5. آئس ہاکی کیا ہے اور کن کن ملکوں میں کھیلی جاتی ہے؟
6. ہاکی کی ٹیم میں کتنے کھلاڑی ہوتے ہیں؟
7. دھیان چند کون تھے اور ان کی پیدائش کہاں ہوئی تھی؟
8. ہندوستانی ٹیم کے منیجر نے 'کرو یا مرو' کا نعرہ کیوں دیا؟
9. لوگوں کو دھیان چند کی اسٹک کے بارے میں کیا شک تھا؟
10. جرمنی کے تماشائیوں نے دھیان چند کو کیا نام دیا؟
11. ہندستان نے ہاکی میں پہلا طلائی تمغہ کس اولمپک مقابلے میں حاصل کیا تھا؟
12. دھیان چند کو 'ہاکی کا جادوگر' کیوں کہا جاتا ہے؟
13. دھیان چند نوجوان کھلاڑیوں کو کیا نصیحت کیا کرتے تھے؟

خالی جگہ کو بھریے۔

1. ہاکی.............میں کھیلا جانے والا کھیل ہے۔
2. ہاکی کا کھیل فرانس میں ....کے نام سے شروع ہوا۔
3. انگلینڈ میں اس کھیل کے ....بنائے گئے۔
4. بند اسٹیڈیم میں بھی............کھیلی جاتی ہے۔
5. 1928 میں ....کو فائنل میں ہرا کر ہاکی کا ....تمغہ حاصل کیا۔
6. پوری ٹیم کو ....ہو کر کھیلنا چاہیے۔

واحد کی جمع اور جمع کے واحد لکھیے۔

طریقہ　　صدیوں　　ضابطہ　　حکّام　　خدمت

بلند آواز سے پڑھیے۔

یونان　قبیلے　صدی　طلائی　تمغہ　عظیم　منیجر　لچک دار
مغرور　خدمت　باشندہ　شہرت

پڑھیے اور سمجھیے۔

احمد نے ایک خط لکھا
یاسمین سنترے کھائے گی

پہلے جملے میں ''لکھا'' اور دوسرے جملے میں ''کھائے گی'' سے کام کا کرنا ظاہر ہوتا ہے یہ الفاظ ''فعل'' ہیں۔

احمد اور یاسمین الفاظ کام کرنے والے کو ظاہر کرتے ہیں جو لفظ کام کرنے والے کے لیے آتا ہے اسے ''فاعل'' کہتے ہیں۔ ان جملوں میں فعل اور فاعل کے علاوہ کچھ اور باتیں کہی گئی ہیں۔ پہلے جملے میں لکھنے کا اثر ''خط'' پر اور دوسرے جملے میں کھانے کا اثر ''سنترے'' پر ہوتا ہے۔ لفظ ''خط اور سنترے'' اسم ہیں۔ جس اسم پر فعل کا اثر ظاہر ہو اسے ''مفعول'' کہتے ہیں۔

غور کرنے والی بات

- کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ''کھیلو گے کودو گے ہوگے خراب، پڑھوگے لکھوگے بنوگے نواب'' اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بچّوں کو کھیلنا نہیں چاہیے۔ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کھیل کود میں حصہ لے کر جسمانی صحت کی طرف توجہ دینا بھی ضروری ہے۔ شخصیت کی مکمل ترقی کے لیے پڑھنا، لکھنا اور کھیل دونوں لازم ہیں کیوں کہ صحت مند جسم ہی میں صحت مند دماغ ہوتا ہے۔

گُلِ عبّاس

میں ایک چھوٹے سے کالے کالے بیج میں رہتا تھا۔ یہی میرا گھر تھا۔ اس کی دیواریں خوب مضبوط تھیں اور مجھے اس کے اندر کسی کا ڈر نہ تھا۔ یہ دیواریں مجھے سردی سے بھی بچاتی تھیں اور گرمی سے بھی۔ کچھ دن تو میں اِدھر اُدھر رہا لیکن میرا گھر کالی مٹّی میں دبا دیا گیا کہ کوئی اُٹھا کر پھینک نہ دے اور میں کسی شریر لڑکے کے پاؤں تلے نہ آ جاؤں۔ زمین کی مدّھم گرمی مجھے بہت اچھی لگتی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ بس اب میں ہمیشہ مزے سے یہیں رہوں گا، مگر میرے کان میں اکثر میٹھی میٹھی سریلی سی آواز آتی تھی۔ میں ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا کہ آواز کدھر سے آتی تھی، مگر میں سمجھتا ہوں کہ اوپر سے آتی تھی۔ یہ آواز مجھ سے کہا کرتی تھی کہ ''اس گھر سے نکل، بڑھ روشنی کی طرف چل!'' لیکن میں زمین میں اپنے گھر کے اندر ایسے مزے سے تھا کہ میں نے اس آواز کے کہنے پر کان نہ دھرا اور جب اس نے بہت پیچھا کیا تو میں نے صاف کہہ دیا کہ: ''نہیں — میں تو یہیں رہوں گا۔ بڑھنے اور گھر سے نکلنے سے کیا فائدہ۔ یہیں چین سے سونے میں مزہ ہے۔ یہیں! میں تو یہیں رہوں گا۔''

یہ آواز بند نہ ہوئی۔ ایک دن اس نے ایسے پُر اثر انداز سے مجھ سے کہا: ''چلو روشنی کی طرف چلو'' کہ مجھے پھریری سی آ گئی اور مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے سوچا کہ اس گھر کی دیواروں کو توڑ کر باہر نکل ہی آؤں، مگر دیواریں مضبوط تھیں اور میں کمزور۔ اب جب وہ آواز مجھ سے کہتی کہ ''بڑھے چلو'' تو میں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا تھا اور مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میں بہت طاقتور ہو گیا ہوں۔ آخر کو اللہ کا نام لے کر جو زور لگایا تو دیوار ٹوٹ گئی اور میں ہرا کِلّہ بن کر نکل آیا۔ اس دیوار کے بعد زمین تھی، مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور اس کو بھی ہٹا دیا۔ اب میں نے اپنی جڑوں کو نیچے بھیجا کہ خوب مضبوطی سے جگہ پکڑ لیں۔ آخر کو ایک دن میں زمین کے اندر سے نکل ہی آیا اور آنکھیں کھول کر دُنیا کو دیکھا۔ کیسی خوبصورت اور اچھی جگہ ہے۔

کچھ دنوں بعد تو خوب ادھر اُدھر پھیل گیا اور ایک دن اپنی کلی کا منہ جو کھولا تو سب لوگ کہنے لگے: ''دیکھو یہ کیسا خوبصورت لال لال گُلِ عبّاس ہے۔'' میں نے بھی جی میں سوچا کہ اس تنگ گھر کو چھوڑا تو اچھا ہی ہے۔ آس پاس اور بہت سے گُلِ عبّاس تھے۔ میں ان سے خوب باتیں کرتا اور ہنستا بولتا تھا۔ دن بھر ہم سورج کی کرنوں سے کھیلا کرتے تھے اور رات کو چاندنی سے۔ ذرا آنکھ لگتی تو آسمان کے تارے آکر ہمیں چھیڑتے تھے اور اُٹھا دیتے۔ افسوس! یہ مزے زیادہ دن نہ رہے۔ ایک دن صبح ہمارے کان میں ایک سخت آواز آئی۔ ''گُلِ عبّاس چاہیے، ہیں گُلِ عبّاس!'' ''اچھا جتنے چاہے لے لو۔'' ہمارے سمجھ میں یہ بات کچھ نہ آئی اور ہم حیرت ہی میں تھے کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ اور ارادہ کر رہے تھے کہ ذرا چل کر اپنے دوست ستاروں سے کہیں کہ دوڑو! ہماری مدد کرو، یہ کیسا معاملہ ہے! اتنے میں کسی نے قینچی سے ہمیں ڈنٹھل سمیت کاٹ لیا اور ایک ٹوکری میں ڈال دیا۔

اب یاد نہیں کہ اس ٹوکری میں کتنی دیر پڑے رہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ میں اوپر تھا نہیں تو گھٹ کر مر جاتا۔ شاید میں سو گیا ہوں گا، کیونکہ جب میں اُٹھا ہوں تو میں نے دیکھا پانچ چھ اور ساتھیوں کے ساتھ مجھے بھی ایک خوبصورت تاگے سے باندھ کر کسی نے گُلدستہ بنایا ہے۔ آس پاس نظر ڈالی تو نہ باغ کی روشیں تھیں، نہ چڑیوں کا گانا۔ سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی میلی کچیلی دُکان تھی۔ ہزاروں آدمی ادھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ یکّے گاڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ فقیر بھیک مانگ رہے تھے اور کوئی ایک پیسہ نہ دیتا تھا۔ میرا جی ایسا گھبرایا کہ کیا کہوں۔ ستاروں کو ڈھونڈا تو ان کا پتہ نہیں، چاند کو تلاش کیا تو وہ غائب۔ سورج کی کرنیں بھی سڑک تک آ کر رُک گئی تھیں اور میں پکارتے پکارتے تھک گیا کہ: ''مجھے جانتی ہو؟ روز ساتھ کھیلتی تھیں، ذرا پاس آؤ اور بتاؤ کہ یہ معاملہ کیا ہے؟'' مگر وہ ایک نہ سنتی تھیں۔ شام ہونے کو آئی تو ایک خوبصورت لڑکی دکان کے پاس سے گزری۔ ہماری طرف دیکھا۔ پھولوں والے نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس زور سے جھٹکا دے کر لڑکی کے سامنے رکھا کہ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

پھولوں والوں نے کہا: ''بیٹی! دیکھو کیسے خوبصورت گُلِ عبّاس ہیں۔ ایک آنے میں گُلدستہ، ایک آنے میں۔''

لڑکی نے اکنّی دی اور ہمیں ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے ہاتھ ایسے نرم نرم تھے کہ یہاں آ کر جان میں جان آئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد شاید میں بے ہوش ہو گیا۔ اصل بات یہ تھی کہ پانی نہیں ملا تھا اور پیاس بہت لگی تھی۔ لڑکی

نے شیشے کے ایک گُلدان میں پانی بھر کر ہمیں پلایا تو ذرا طبیعت ٹھیک ہوئی اور میں نے سر اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اب میں ایک صاف کمرے میں تھا۔ جس میں کئی بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف سے ایک بیمار لڑکی کی آواز سنائی دی: ''ڈاکٹر صاحب! کیا میں اچھی نہیں ہوں گی، کیا اب میں کبھی چل پھر نہ سکوں گی؟ کیا کبھی باغ میں کھیلنے نہ جا سکوں گی۔ اور کیا اب کبھی گُلِ عبّاس دیکھنے کو نہ ملیں گے؟'' یہ کہتے کہتے بچی کی ہچکی بندھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو پونچھ کر کروٹ لی تو اس کو میں اور میرے ساتھی گلدان میں رکھے ہوئے دکھائی دیے۔ لڑکی خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔ پاس جو نرس کھڑی تھی اس نے ہمیں اُٹھا کر اس لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس پیاری بچّی نے ہمیں چوما۔

اس کے گورے گورے گالوں میں ہماری سُرخی کی ذرا سی جھلک آ گئی۔

اس وقت سمجھ میں آیا۔ بیج کا گھر چھوڑ کر روشنی کی طرف بڑھنے کی غرض یہی تھی کہ ایک دُکھیاری بیمار بچّی کو کم سے کم تھوڑی دیر کی خوشی ہم سے مل جائے۔

(غلام عباس)

معنی یاد کیجیے

گلِ عباس	:	ایک قسم کا پھول جن میں سے کچھ خالص سرخ، کچھ گلابی، کچھ زرد اور کچھ پانچ رنگ کے ہوتے ہیں، اِسے گلِ عباسی بھی کہتے ہیں
مدّھم	:	دھیما، آہستہ
سریلی	:	مدھر آواز، ایسی آواز جس میں سُر ہو
پھریری	:	جھُرجھری
ہرا کِلّہ	:	ہری کونپل

روشیں	:	روش کی جمع، کیاریوں کے درمیان کا راستہ، پگڈنڈی
اکنّی	:	ایک آنہ، ایک سِکّہ جو چار پیسے کے برابر ہوتا تھا۔

سوچیے اور بتائیے۔

1. گُلِ عبّاس کا گھر کیسا تھا؟
2. گُلِ عباس کا نیا گھر کیسا تھا؟
3. گُلِ عباس نے بیج کی دیوار کس طرح توڑی؟
4. باغ سے نکلنے کے بعد گل عباس پر کیا گزری؟
5. گُلِ عباس کو لڑکی کے پاس پہنچ کر کیا محسوس ہوا؟
6. ڈاکٹر سے باتیں کرتے کرتے لڑکی کی ہچکی کیوں بندھ گئی؟
7. بیمار لڑکی کے خوش ہونے کی کیا وجہ تھی؟
8. گُلِ عباس کے ساتھ بیمار بچّی نے کیسا سلوک کیا؟

خالی جگہ کو صحیح لفظ سے بھریے۔

1. میں ایک چھوٹے سے کالے بیج میں ....تھا۔
2. دیواریں مجھے سردی سے بھی بچاتی تھیں اور ....بھی۔
3. دن بھر ہم سورج کی ....سے ....کرتے تھے۔
4. شام ہونے کو آئی تو ایک خوبصورت لڑکی دکان کے................گزری۔
5. اس کے ہاتھ ایسے...............تھے کہ یہاں آ کر جان میں ....آئی۔

نیچے دیے ہوئے جملوں کو کہانی کی ترتیب سے لکھیے۔

کچھ دن تو میں ادھر اُدھر رہا لیکن میرا گھر کالی مٹی میں دبا دیا گیا۔

میں ایک چھوٹے سے کالے کالے بیج میں رہتا تھا۔
کسی نے قینچی سے ہمیں ڈنٹھل سمیت کاٹ لیا اور ایک ٹوکری میں ڈال دیا۔
آخر کو اللہ کا نام لے کر جو زور لگایا تو دیوار ٹوٹ گئی۔
شام ہونے کو آئی تو ایک خوبصورت لڑکی دکان کے پاس سے گزری۔
آس پاس نظر ڈالی تو نہ باغ کی روشیں تھیں اور نہ چڑیوں کا گانا۔
ایک طرف سے ایک بیمار لڑکی کی آواز سنائی دی۔
پھولوں والوں نے کہا بیٹی دیکھو کیسے خوبصورت گُلِ عبّاس ہیں۔
ایک دُکھیاری بیمار بچی کو کم سے کم تھوڑی دیر کی خوشی ہم سے مل جائے۔
ڈاکٹر صاحب کیا میں اچھی نہیں ہوں گی۔

صحیح جملوں کے سامنے صحیح (✓) اور غلط کے سامنے (×) کا نشان لگائیے۔

1. ایک کالا کالا سا بیج ہی گُلِ عبّاس کا گھر تھا۔ ( )
2. گُلِ عبّاس کو دنیا بڑی خوبصورت اور اچھی لگی۔ ( )
3. گُلِ عبّاس کا رنگ پیلا ہوتا ہے۔ ( )
4. پھولوں والوں نے کہا بیٹی ''دیکھو کیسے خوبصورت گُلِ عبّاس ہیں۔ ( )
5. فقیر بھیک مانگ رہے تھے اور کوئی ایک پیسہ نہ دیتا تھا۔ ( )
6. شام کو ایک بدصورت لڑکی دکان کے پاس سے گزری۔ ( )
7. لڑکی خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔ ( )
8. اس پیاری بچی نے ہمیں باہر پھینک دیا۔ ( )

عملی کام

- گُلِ عبّاس کی کہانی کا خلاصہ اپنے لفظوں میں لکھیے۔

- جن پھولوں کے ناموں سے آپ واقف ہیں ان کی ایک فہرست بنایئے اور اس کے علاوہ دوسرے پھولوں کے بارے میں بھی واقفیت حاصل کیجیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

چور چلا گیا

اجنبی ہانپ رہا تھا

سورج نکلا

ان جملوں میں چور، اجنبی اور سورج فاعل ہیں۔ چلا گیا، ہانپ رہا تھا اور نکلا فعل ہیں۔ ان جملوں میں مفعول نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان جملوں کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ ایسے جملوں کے فعل کو ''فعل لازم'' کہتے ہیں۔

ایسے فعل جو فاعل کے ساتھ مل کر پورا مطلب بتا دے اسے فعلِ لازم کہتے ہیں۔

سونا، بیٹھنا، دوڑنا، ہنسنا، رونا، آنا اور جانا سے جو فعل بنتے ہیں وہ ''فعل لازم'' ہوتے ہیں۔

غور کرنے کی بات

- آج کی دنیا میں رہنے والے دکھوں اور تکلیفوں سے گھرے ہوئے ہیں، چند لمحوں کی خوشیاں بھی آسانی سے میسّر نہیں ہو پاتیں۔
- اس سبق کا مرکزی خیال یہ ہے کہ گُلِ عبّاس اپنے وجود سے ایک دکھیاری بچی کو کم سے کم تھوڑی دیر کی خوشی تو دیتا ہے۔ اُس کے گورے گورے گالوں پر سرخی کی جھلک لانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔
- لال لال گُلِ عبّاس گلدان میں پاکر لڑکی خوشی سے تالیاں بجانے لگتی ہے۔

دیوالی کے دیپ جلے

نئی ہوئی پھر رسم پرانی، دیوالی کے دیپ جلے — شام سلونی رات سہانی دیوالی کے دیپ جلے

دھرتی کا رس ڈول رہا ہے دور دور تک کھیتوں کے — لہرائے وہ آنچل دھانی دیوالی کے دیپ جلے

نرم لووں نے زبانیں کھولیں پھر دنیا سے کہنے کو — بے وطنوں کی رام کہانی دیوالی کے دیپ جلے

آج منڈیروں سے گھر گھر کی نور کے چشمے پھوٹ پڑے — پگھلے شعلوں کی یہ روانی، دیوالی کے دیپ جلے

جلتے دیپک رات کے دل میں گھاؤ لگاتے جاتے ہیں شب کا چہرہ ہے نورانی، دیوالی کے دیپ جلے
چھیڑ کے سازِ نشاطِ چراغاں آج فراقؔ سناتا ہے
غم کی کتھا خوشی کی زبانی دیوالی کے دیپ جلے

(فراق گورکھپوری)

معنی یاد کیجیے

سلونی	:	سانولی
دھانی	:	زردی لیے ہوئے سبز رنگ، ہلکا سبز رنگ
منڈیر	:	سر دیوار، دیوار کا اوپری حصّہ
نور	:	روشنی
روانی	:	بہاؤ
گھاؤ	:	زخم
نورانی	:	نور سے بھرا ہوا، روشن، چمکدار
سازِ نشاطِ چراغاں	:	ساز یعنی باجہ، نشاط یعنی خوشی دیوالی خوشیوں کا تہوار ہے اس میں خوشی کے چراغ جلائے جاتے ہیں
کتھا	:	کہانی، داستان

سوچیے اور بتائیے۔

1. دھانی آنچل کے لہرانے سے کیا مراد ہے؟
2. چراغ کی لویں دنیا سے کیا کہہ رہی ہیں؟
3. منڈیروں سے نور کے چشمے کس طرح پھوٹتے ہوئے لگ رہے ہیں؟
4. رات کے دل میں گھاؤ لگنے سے کیا مراد ہے؟
5. شاعر غم کی کتھا کیوں سنا رہا ہے؟

مصرعوں کو مکمل کیجیے۔

1. لہرائے............دیوالی کے دیپ جلے
2. آج منڈیروں سے گھر گھر کی ....
3. چلتے دیپک رات کے ....
4. پگھلے شعلوں ....دیوالی کے دیپ جلے
5. چھیڑ کے ....آج فراق سناتا ہے

نیچے دیے ہوئے لفظوں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

رسم سلونی منڈیر نور روانی نورانی

ان لفظوں کے متضاد لکھیے۔

شب پرانی نور نشاط غم

املا درست کیجیے۔

نشات   صاز   بے وتن   ثلونی   چراگاں

عملی کام

- دیوالی کے موضوع پر اور بھی کئی شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں۔اسکول کی لائبریری سے کتاب لے کر نظیر اکبرآبادی کی نظم دیوالی پڑھیے اور لکھیے۔
- دیوالی کارڈ بنا کر اس میں رنگ بھریے۔

پڑھیے اور سمجھیے۔

<u>اکرم</u> نے پوچھا	<u>میں</u> نے پوچھا
<u>اکرم</u> کو روٹی دی	<u>مجھے</u> روٹی دی
<u>اکرم</u> کا سر پھٹ گیا	<u>میرا</u> سر پھٹ گیا

اوپر کے جملوں میں خط کشیدہ الفاظ ترتیب وار فاعلی، مفعولی یا اضافی حالت میں ہیں۔ پہلے کالم میں یہ اسم ہیں دوسرے میں ضمیر۔ حالت کی تبدیلی سے اسم میں تبدیلی نہیں ہوتی لیکن ضمیر میں تبدیلی ہوگئی۔

غور کرنے کی بات

- دیوالی خوشیوں کا تہوار ہے لیکن خوشی اور غم کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔خوشی کے موقعے پر کچھ محرومیاں اور ناکامیاں بھی یاد آجاتی ہیں وہ انسان کو غم زدہ کر دیتی ہیں۔اس نظم میں دیوالی کی خوشی کے ساتھ ساتھ غم کی یہی کیفیت ظاہر کی گئی ہے۔

چچا کبابی دِلّی والے

جامع مسجد کے پھلواری والے چبوترے کے نیچے پٹری پر، جہاں اور کوئی دُکان دار نہیں بیٹھتا تھا، شام کے پانچ چھ بجے ایک کبابی صاحب دُکان لگایا کرتے تھے اور رات کے بارہ ایک بجے تک کباب بیچتے تھے۔ اُن کا نام مجھے معلوم نہیں۔ چچا کبابی کہلاتے تھے۔

چچا کبابی غدر 1857 کے دس بارہ سال بعد پیدا ہوئے ہوں گے اور 1947 سے چند سال قبل اِنتقال کر گئے۔ دِلّی کے سیخ کے کباب اور گولے کے کباب مشہور ہیں۔ چچا کبابی دلّی کے ممتاز کبابی تھے۔ کباب بنانے کے اعتبار سے بھی اور انوکھی طبیعت کے اعتبار سے بھی۔ کباب بنانے کے کمال پر اُنھیں بڑا گھمنڈ تھا؛ اور طبیعت کا انوکھا پن تو اس سے عیاں ہے کہ اپنے لیے وہ جگہ انتخاب کی تھی جہاں گاہک کو آنا ہو تو جامع مسجد کے جنوبی دروازے کی طرف

کے دسیوں کبابیوں کو چھوڑ کر آئے۔ ایک گیارہ برس کی لڑکی آگ کا تاؤ رکھنے کی غرض سے ہر وقت پنکھا ہاتھ میں پکڑے کھڑی رہتی تھی۔ غالبًا اُن کی بیٹی تھی۔ ذرا تاؤ کم وبیش ہوا چچا کبابی کا پارہ چڑھا۔ غصّہ ناک پر رکھا رہتا تھا، لیکن کیا مجال جو زبان سے بیہودہ لفظ نکل جائے۔

گاہکوں کو باری باری کر کے کباب دیتے تھے۔ اگر آپ ان کے ہاں اوّل مرتبہ تشریف لائے ہیں اور ان کی طبیعت سے واقف نہیں ہیں، اور دوسرے گاہکوں کی نسبت آپ کی حیثیت بلند ہے، صاف سُتھرا پہنتے ہیں، تانگہ یا موٹر روک کر کباب خریدنے اُتر پڑے ہیں، آپ نے خیال کیا کہ مجھے ترجیح دی جانی چاہیے۔ ہاتھ بڑھایا، روپے تھمائے اور فرمایا۔ ''ڈیڑھ روپے کے کباب ذرا جلدی۔'' جلدی کا لفظ سُنتے ہی چچا کبابی کا مزاج بگڑ جائے گا۔ وہ روپے واپس کر دیں گے اور کہیں گے۔ ''حضور! جلدی ہے تو کسی اور سے لے لیجیے۔''

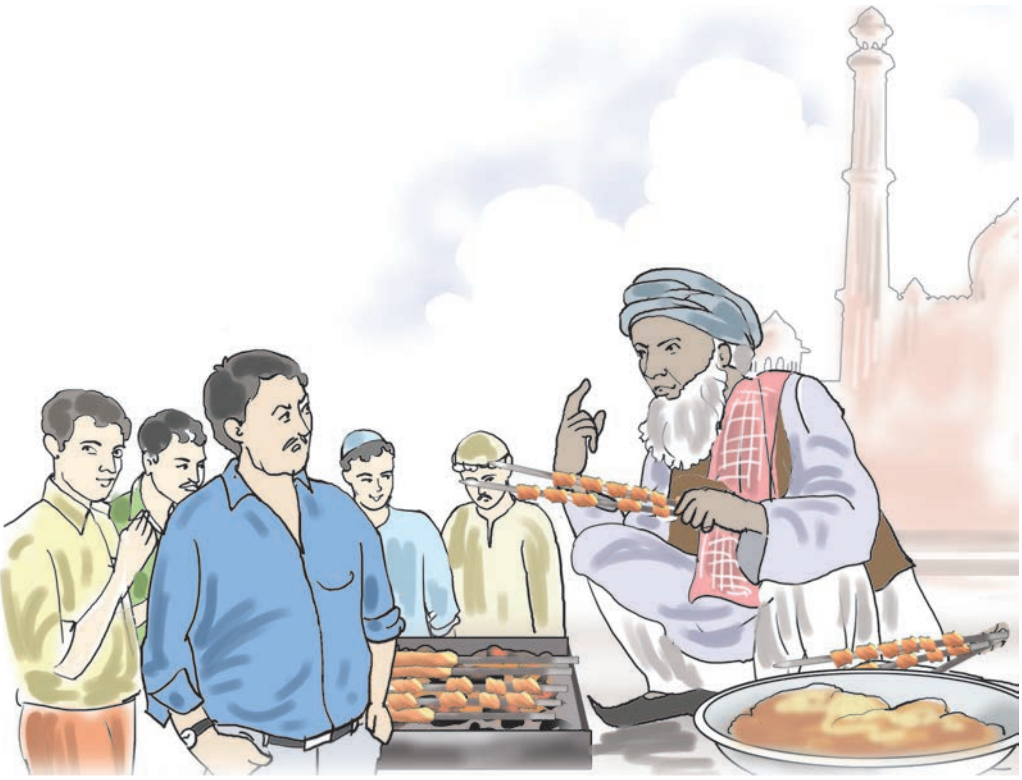

ایک روز ایک ذرا زندہ دل سے شخص چچا کبابی سے اُلجھ گئے۔ اُنھوں نے چچا کبابی کے اس فِقرے پر فقرہ جڑ دیا کہ ''بھائی! اور سے ہی لے لیں گے، اللہ نے تمھارے کبابوں سے بچایا۔ نہ جانے ہضم ہوتے یا کوئی آفت ڈھاتے۔'' چچا کبابی تلملا اُٹھے۔ کہنے لگے۔ ''حضور! کبابوں میں وہ مسالہ ڈالتا ہوں جسے مست بجار پر لتھیڑ دوں تو گل کر گِر پڑے۔ میرے کبابوں سے آپ کو تکلیف پہنچ جائے تو ہسپتال تک کا خرچ دوں گا، لیکن کباب جلدی نہیں دے سکتا۔ جلدی میں کباب یا تو کچّے رہ جاتے ہیں یا جل جاتے ہیں اور دوسرے گاہکوں کا حق بھی چھنتا ہے، جو پہلے آیا ہے کباب اسے پہلے مِلنے چاہئیں۔''

چچا کبابی دھونس نہیں برداشت کرتے تھے اور اپنے اُصول کے مقابلے میں تعلقات کو بھول جاتے تھے۔ عزیز اور دوست بھی ان سے بغیر باری کے کباب نہیں لے سکتے تھے۔ آپ جائیے، ان کو سلام کیجیے۔ جواب دیں گے، وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہِ وبرکاتہٗ۔ پانوں کی ڈبیہ سامنے رکھ دیجیے۔ بے تکلّف پان کھا لیں گے۔ زردہ خود مانگیں گے۔ لیکن ناممکن ہے کہ سلام یا پان سے چچا کبابی پگھل جائیں۔ کباب باری پر ہی دیں گے۔

ایک دفعہ میری موجودگی میں تیرہ چودہ برس کا ایک لڑکا آیا اور بولا:

''چار پیسے کے کباب دے دو۔''

چچا کبابی نے کہا ''نہیں بھائی، میں تجھے کباب نہیں دوں گا۔''

اب وہ لڑکا سر ہو رہا ہے اور خوشامدیں کر رہا ہے اور چچا کبابی انکار پر انکار کیے جاتے ہیں۔ جب بہت دیر اس حجّت بازی میں گُزر گئی تو کِسی نے ہمّت کر کے پوچھ لیا۔ ''چچا، کیا بات ہے۔ اسے کباب کیوں نہیں دے رہے؟''

کہنے لگے ''میاں! یہ پیسے چُرا کر لاتا ہے۔ گھر سے لاتا ہو یا کہیں اور سے، روز چار پیسے کے کباب کھا جاتا ہے، یہیں بیٹھ کر۔ دیکھو نا! اس کی صورت۔ جا بیٹا جا۔ عادت کہیں اور جا کر بِگاڑ۔ میں چار پیسے کی خاطر تجھے تباہی

کے راستے پر نہیں لگاؤں گا۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ تیرے ماں باپ چار پیسے روز تجھے کباب کھانے کے واسطے دیتے ہوں گے۔''

جو لوگ ان کی دُکان پر، تازے اور گرم گرم کباب کھا لیتے تھے، اُن سے خوش ہوتے تھے۔ پیسے تھمائیے اور

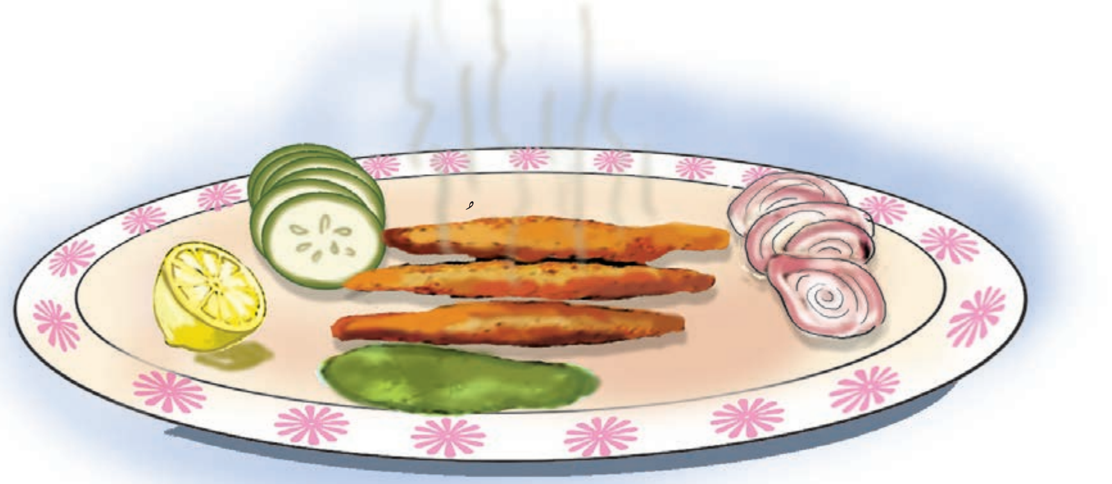

بتا دیجیے کہ اوپر جامع مسجد کے دالان میں انتظار کر رہا ہوں۔ کباب بھیج دینا یا آواز دے دینا۔ ایسے لوگوں کے کباب گھی سے بگھارتے، کبابوں میں بھیجا ملاتے۔ پیاز، پوٗدینہ اور ہری مرچیں چھڑکتے اور اپنے آدمی کے ہاتھ

پہنچوا دیتے۔ اللہ بخشے مولانا راشد الخیری کو۔ چچا کبابی کے ہاتھ کے کباب بے حد مرغوب تھے۔ وہ میرے ساتھ ہوتے تو میں بھی جامع مسجد چلا جاتا اور وہیں کباب منگا لیتا تھا۔ تازے کبابوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

(ملّا واحدی)

معنی یاد کیجیے

چبوترے	:	زمین کی سطح سے اونچی تعمیر کی ہوئی بیٹھنے کی جگہ
سیخ	:	لوہے کی لمبی چھڑ یا سلاخ جس پر گوشت یا قیمہ لگا کر انگاروں پر سینکتے ہیں
عیاں	:	ظاہر
انتخاب	:	چننا، چھانٹنا
گاہک	:	خریدار
جنوبی	:	دکھنی
آگ کا تاؤ	:	آگ کی تیز آنچ یا حرارت
کم وبیش	:	تقریباً
پارہ چڑھنا (محاورہ)	:	غصّہ ہونا
غصّہ ناک پر رکھا رہنا	:	بہت جلدی غصّہ آنا
مجال	:	ہمّت، جراءت
بے ہودہ	:	بدتمیز
نسبت	:	تعلق، ربط، مناسبت
ترجیح	:	برتری، فوقیت، سبقت
فقرہ	:	جملے کا ٹکڑا
تلملانا	:	بے چین ہونا، تڑپنا

بجار	:	موٹا تازہ بیل یا سانڈ
دھونس	:	دھمکی، رعب
لتھیڑنا	:	لپیٹنا، ملنا
حجّت بازی	:	بے جا بحث وتکرار
مرغوب	:	پسندیدہ

سوچیے اور بتائیے۔

1. چچا کبابی اپنی دُکان کہاں لگایا کرتے تھے؟
2. چچا کبابی کی شخصیت کی کیا خوبیاں تھیں؟
3. چچا کبابی اپنے گاہکوں کو کباب دینے کے لیے کیا طریقہ اپناتے تھے؟
4. چچا کبابی نے زندہ دل شخص کو کیا جواب دیا؟
5. چچا کبابی نے بچّے کو کباب دینے سے انکار کیوں کیا؟

نیچے دیے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

عیاں　　انتخاب　　مجال　　ترجیح　　تباہی　　مرغوب　　حُجّت　　تلملانا

عملی کام

- اس سبق میں ایک مرکب لفظ حجّت بازی استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے حجّت کرنا۔ اسی طرح 'بازی' لگا کر پانچ مرکّب الفاظ بنائیے۔
- آپ نے چچا کبابی دلّی والے کا خاکہ پڑھا۔ آپ کو اپنے پڑوس میں یا کہیں اور ایسی شخصیت نظر آئی ہو جو عام لوگوں سے الگ ہو اس کے بارے میں ایک صفحہ لکھیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

اس سبق میں ایک مرکب لفظ حجت بازی استعمال ہوا ہے۔جس کا مطلب ہے حجّت کرنا۔بعض لفظوں کے آخر میں کچھ لفظ جوڑ کر نئے لفظ بنا لیے جاتے ہیں ایسے نئے لفظوں کو مرکّب الفاظ کہتے ہیں۔اسی طرح ''بازی'' لگا کر پانچ مرکب الفاظ بنائیے۔

غور کرنے کی بات

- اس سبق میں ایک فقرہ ''اللہ بخشے راشد الخیری کو'' استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم ہے اللہ راشد الخیری کو معاف کرے۔کسی مرحوم شخص کا تذکرہ کرنے کا یہ شائستہ اور دینی طریقہ ہے جب بھی اس شخص کو یاد کیا جائے تو اس کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کی جائے۔
- اس سبق میں لفظ ''غدر'' آیا ہے، جس کے معنی ہیں شور شرابہ، ہنگامہ، افراتفری، فتنہ وفساد، سرکشی یا بغاوت۔اس لفظ کو 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے لیے انگریزوں نے استعمال کیا۔ وہ اسے قومی آزادی کی پہلی جنگ تسلیم نہیں کرتے تھے۔اسی لیے لوگ 1857 کے ہنگاموں کو انگریزوں ہی کی طرح غدر کہنے لگے ہیں۔ 1857 کا ہنگامہ در اصل ہندستانیوں کی قومی بیداری اور برطانوی سامراج سے آزادی کی جد و جہد کا پہلا نشان ہے۔اس جد و جہد کے دوران ہندو مسلمان غرض کہ پورا ملک، بغیر کسی مذہبی تفریق کے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں ساتھ ساتھ تھا اور انھیں اپنا پیشوا تسلیم کرتا تھا۔

کندن لال سہگل

شرت چند چٹرجی کے ناول پر مبنی اور پریما نگر آتر تھی کی ہدایت میں پہلی فلم ''دنیا پاونا'' بنگالی زبان میں بنی تھی۔ بی۔این۔سرکار نے دوسری فلم ہندوستانی زبان میں بنانے کا فیصلہ کیا تو اس کے لیے اے۔این۔شور نے محبت کے آنسو کے عنوان سے کہانی لکھی جس میں دو محبت کرنے والے ماں باپ کے پرانے خیالوں کے باعث مل نہیں پاتے۔ مکالمے نیو تھیٹرز کے جنرل منیجر آئی۔ اے۔ حافظ جی نے لکھے۔ ہدایت کاری کا مشکل کام پھر پریما نگر آتر تھی کو ہی سونپا گیا جو اس وقت نیو تھیٹرز کے واحد ہدایت کار تھے۔

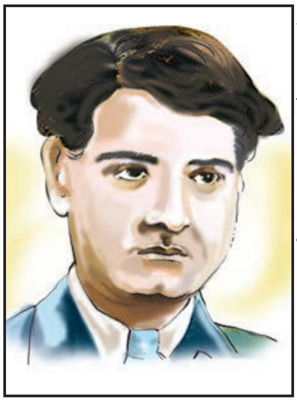

آر۔پی۔بورال نے موسیقی کی ذمہ داری سنبھالی۔ مرد کے مرکزی کردار کو چھوڑ کر دوسرے اداکاروں کا انتخاب بھی ہو گیا تھا مگر جب دولہا ہی غائب ہو تو بارات کیسے چڑھے یعنی ہیرو کے رول کے لیے کوئی مناسب مغنّی اداکار نہیں مل رہا تھا جو تھے وہ ہندوستانی زبان میں نہیں گا سکتے تھے۔اسی لیے فلم کی شوٹنگ شروع نہیں ہو پا رہی تھی۔ان سے ملیے: یہ کے۔ ایل۔سہگل ہیں۔نتین بوس نے سہگل کا تعارف آتر تھی سے کرایا تو سہگل نے ہاتھ جوڑ کر انھیں نمسکار کیا۔آتر تھی صاحب نے بھی جواب میں نمسکار کیا۔مگر ان کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے اور آنکھوں میں ایک سوالیہ نشان۔سہگل صاحب ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔نتین بوس نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔'' آپ کی فلم کے ہیرو سرکار صاحب نے کچھ دیر پہلے ہی ان کے ساتھ معاہدہ کیا ہے۔''

''ہیرو'' اور میری فلم کے آتر تھی کی آنکھوں پر سوالیہ نشان مزید بڑا اور گہرا ہو گیا۔'' ہاں یہ بہت اچھا گاتے

ہیں۔'' سرکار صاحب نے ان کا گانا سنا۔ بورال دا نے بھی سنا ہے۔ وہ ان کے گانے سے بہت مطمئن ہیں۔ نتین بوس نے پرجوش انداز میں کہا۔

پریمانگر کے ماتھے کی شکنیں گہری ہوگئیں۔ انھوں نے ترچھی نظروں سے نتین بوس کی طرف دیکھا۔'' گانا تو ٹھیک ہے مگر ایکٹنگ؟ اس کا کیا ہوگا؟''

'' ایکٹنگ بھی یہ کرلیں گے اچھا کریں گے، ایک بار دیکھیے تو سہی۔''

'' یہ ناممکن ہے'' آترتھی نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔ پھر سہگل کی طرف گھورتے ہوئے بولے۔'' اس لمبے سوکھے بدن کے ساتھ کیا خاک ایکٹنگ کریں گے۔ دیکھنے سے لگتا ہے جیسے بانس پر کپڑے لٹکا دیے گئے ہوں۔ نہ صورت، نہ صحت۔''

پھر کچھ پل کی خاموشی کے بعد اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بولے۔'' نہیں یہ میری فلم کے ہیرو نہیں ہوسکتے۔''

نتین بوس یہ سن کر سکتے میں آ گئے۔ کیا جواب دیں آترتھی کی بات کا؟ اُدھر سہگل کی حالت خراب تھی۔ ان کا ایک ایک لفظ ان کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔ پہلے وہ یہ سوچ کر خوش تھے کہ انھیں اپنی منزل مل گئی، لیکن اب لگا کہ جسے وہ اپنی منزل سمجھ رہے تھے وہ محض ایک چھلاوا تھا۔

'' موسیقی تو ایک مسلسل ہنر ہے بیٹے۔'' ان کے کانوں میں اچانک جموں کے پیر بابا کی آواز گونجنے لگی۔'' اس میں منزل نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔'' اگر کچھ ہوتا ہے تو بس ریاض اور ذکر جس کا کوئی خاتمہ نہیں۔ آخر دم تک اسے نبھانا پڑتا ہے۔ اگر تم یہ کرسکے تو تمھاری روح کو سکون ملے گا۔''

سلمان پیر کی یہ بات یاد آتے ہی سہگل کو سچ مچ بہت سکون ملا۔ ان کی خود اعتمادی جو ذرا دیر پہلے ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی پھر سے لوٹ آئی اور آترتھی صاحب کی بات کا جواب اس بار نتین بوس نے نہیں بلکہ خود انھیں نے دیا۔

'' ایسا کیوں کہتے ہیں دادا! آپ تو پارس ہیں، لوہے کو چھولے تو سونا بن جائے۔ پھر میں آپ کی فلم کا ہیرو کیوں نہیں بن سکتا؟ آپ ہی بتائیے۔ میرے سر پر آپ کا ہاتھ ہوگا تو میں آسمان کو زمین پر اتار لاؤں گا۔''

اپنی بات کہتے ہوئے سہگل کے چہرے پر جو چمک تھی اس نے پریمانگر آترتھی کے دل کو چھولیا۔ پھر بھی انھوں نے آہستگی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے دیکھتے ہیں'' اور نتین بوس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''نتین ریہرسل شروع کراؤ۔'' پریمانگر آترتھی کی موجودگی میں محبت کے آنسو کی ریہرسل لگاتار دو مہینے تک چلتی رہی۔ سہگل اپنی اداکاری کا بہترین مظاہرہ کررہے تھے۔ آترتھی صاحب مطمئن ہوگئے اور فلم کی شوٹنگ کی تاریخ طے کردی۔ مگر کیمرے کے سامنے آتے ہی سہگل گھبرا گئے اور ٹھیک اسی طرح جیسے شملہ کے ناٹک میں ہوا تھا آترتھی صاحب نے کٹ کہا اور

سہگل کو سمجھایا کہ انھوں نے کیا غلطی کی ہے۔ ''ری ٹیک'' ہوا، مگر اس بار ایک نئی غلطی! آترتھی صاحب نے پھر کٹ کہا، پھر انھیں سمجھایا۔ ''ری ٹیک ہوا''، سات آٹھ ''ری ٹیک'' ہوئے۔ آخر نویں ''ری ٹیک'' پر آترتھی صاحب اپنا توازن کھو بیٹھے اور ''بہت ہو چکا اب اور نہیں'' میں شوٹنگ کینسل کر دوں گا........ کہتے ہوئے اسٹوڈیو سے باہر نکل گئے۔ نتین بوس جانتے تھے کہ ایسے موقعوں پر دادا یہی کرتے ہیں اور اب وہ اپنے اوپر قابو پانے کے لیے اسٹوڈیو

سے باہر گئے ہیں۔سہگل رونے لگے تو نتین بوس نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور کہا رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جاؤ تم بھی باہر گھوم کر آؤ، تمھارا تناؤ کم ہوگا۔مگر سہگل نہیں اٹھے اور پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے اور نتین بوس کے پاس آ کر بولے۔'' دادا میں ایک دن دکھا دوں گا کہ نیوتھیٹر نے میرا انتخاب کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔''

سہگل کی یہ خود اعتمادی تھیٹر کے تمام لوگوں کو متاثر کرتی تھی۔نتین بوس بولے'' آؤ میرے ساتھ ریہرسل کرو۔''

کچھ دیر ریہرسل کرنے کے بعد نتین بوس نے ڈائریکٹر کو خبر بھجوائی کہ وہ چپ چاپ اندر آ جائیں۔سہگل نتین بوس سے بولے۔'' دادا، آپ ایک ٹیک ان کے آنے سے پہلے ہی کیوں نہیں لے لیتے ؟''

نتین بوس نے ان کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا،صرف مسکرائے اور کیمرے کے پیچھے چلے گئے۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ ڈائریکٹر صاحب دروازے کے پیچھے سے دیکھ رہے ہیں لیکن سہگل کو اس کا علم نہیں تھا۔اس بار سہگل سے کوئی چوک نہیں ہوئی اور ڈائریکٹر نے دروازے کے پیچھے سے چلّا کر کہا'' او کے۔او کے'' پھر سہگل کے پاس آ کر ان کی پیٹھ تھپ تھپائی اور بولے'' ویل ڈن، ویل ڈن۔''

سہگل نے حیران نظروں سے ڈائریکٹر کو دیکھا جیسے انھیں یقین نہ ہو رہا ہو کہ یہ وہی آرتھی صاحب ہیں جو کچھ دیر پہلے ناراض ہو کر باہر چلے گئے تھے۔

آرتھی نفسیات کے ماہر تھے۔ سہگل کی نفسیاتی کیفیت ان سے چھپی نہ تھی۔ اس لیے بولے۔ ''دراصل تمھاری کمزوری احساسِ کمتری ہے اس لیے تم اپنا اعتماد کھو بیٹھتے ہو۔''

فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی تو سہگل کے دل میں ایک ڈر پیدا ہوا کہ گھر والوں کو جب پتا چلے گا کہ میں فلموں میں کام کر رہا ہوں تو ناراض ہو جائیں گے۔ اس لیے ان کا فلمی نام کے۔ ایل۔ سہگل رکھا گیا مگر پھر بھی راجا رام شرما نے انھیں پہچان لیا تھا۔ ''ارے یہ تو اپنا 'کندن' ہے۔''

آخر کار 16 جنوری 1932 کو الہ آباد کی شمبھر ٹاکیز میں ''محبت کے آنسو' ریلیز ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ہندوستانی سنیما کے فلک پر ایک ایسا ستارہ چمکا جس نے ہندستانی سنیما کو چکا چوند کر دیا۔

اس فلم میں تقریباً دس گانے تھے مگر آج نہ یہ فلم موجود ہے اور نہ گانوں کی ریکارڈنگ اور نہ اس بات کی

معلومات کہ ان دس گانوں میں سہگل نے کتنے گانے گائے تھے۔ البتہ گانوں کے شروع کے بول اب بھی موجود ہیں اور قیاس کیا جاتا ہے کہ ان دس گانوں میں سے چھ گانے سہگل نے گائے تھے۔

فلم فلاپ ہوئی مگر سہگل کو ان کی آواز اور اداکاری کے دم پر زبردست شہرت ملی۔

(شر ددت)

معنی یاد کیجیے

مبنی	:	بنیاد پر
آمد	:	آنا
دقیانوسی	:	بہت پرانا، پرانے زمانے کا
مکالمہ	:	ہم کلامی، زبانی سوال و جواب، گفتگو
انتخاب	:	چننا، چھانٹنا
مغنّی	:	گانے والا
معاہدہ	:	قول و اقرار، عہد و پیمان، اقرار نامہ
شکن	:	سلوٹ، جھرّی
چھلاوا	:	جو ذرا سی جھلک دکھا کر غائب ہو جائے، آسیب
ریاض	:	محنت، مشقت
خود اعتمادی	:	اپنے آپ پر بھروسہ
پارس	:	ایسا خیالی پتھر جس کے چھونے سے لوہا سونا بن جائے
مظاہرہ	:	ظاہر کرنا
ری ٹیک (retake)	:	(انگریزی لفظ) بار بار دہرانا
توازن	:	اعتدال، وزن کا باہم برابر مل جانا

حوصلہ افزائی	:	ہمت بڑھانا
پتھرائی ہوئی نظر	:	صدمے بھری اور مایوس نگاہیں
تناؤ	:	کھینچاؤ
ریہرسل	:	مشق کرنا، دہرانا
ویل ڈن(well done)	:	(انگریزی لفظ) بہت اچھا کیا
نفسیات	:	دماغی شعور کا علم، وہ علم جو انسان کی باطنی شخصیت سے متعلق ہو
احساس کمتری	:	چھوٹے ہونے کا احساس
قیاس	:	گمان، اٹکل
فلاپ(flop)	:	(انگریزی لفظ) بالکل ناکام

سوچیے اور بتائیے۔

1. شرت چند چٹرجی کے ناول پر بنی پہلی فلم کا کیا نام تھا اور وہ کس زبان میں تھی؟
2. بی۔این۔سرکار نے اپنی دوسری فلم کس زبان میں بنائی؟
3. کے۔ایل۔سہگل نے اپنی کس خوبی سے سرکار صاحب اور بورال دا کو متاثر کیا؟
4. ماتھے کی شکنیں گہری ہونے سے کیا مراد ہے؟
5. کے۔ایل۔سہگل صاحب کو دیکھ کر آتر تھی صاحب نے کیا کہا؟
6. آتر تھی کی باتوں کا سہگل پر کیا اثر ہوا؟
7. ''موسیقی تو ایک مسلسل سفر ہے بیٹے'' یہ آواز سہگل نے کب محسوس کی؟
8. سہگل میں خود اعتمادی کیسے لوٹی؟
9. آتر تھی صاحب سہگل سے کیوں مطمئن ہو گئے؟
10. سہگل کے رونے کی کیا وجہ تھی؟
11. آتر تھی کن خوبیوں کے مالک تھے؟
12. کے۔ایل۔سہگل کو کس وجہ سے شہرت حاصل ہوئی؟

صحیح جملوں کے سامنے صحیح (✓) اور غلط کے سامنے غلط (×) کا نشان لگائیے۔

1. کے۔ایل۔سہگل کی پہلی فلم کا نام ماں کے آنسو تھا۔ ( )
2. ہیرو کے رول کے لیے مناسب کردار موجود تھا۔ ( )
3. کے۔ایل۔سہگل بہت اچھا گاتے تھے۔ ( )
4. کے۔ایل۔سہگل ایک تندرست جسم کے مالک تھے۔ ( )
5. سلمان پیر کی بات سے سہگل کو سچ مچ بہت دکھ ہوا۔ ( )

نیچے لکھے لفظوں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

دقیانوسی انتخاب مکالمہ پارس توازن حوصلہ افزائی تناؤ

نیچے لکھے ہوئے لفظوں کے متضاد لکھیے۔

توازن احساس کمتری مناسب سکون مطمئن اعتماد

عملی کام

- کے۔ایل۔سہگل کی پانچ فلموں کے نام اپنے استاد کی مدد سے لکھیے۔
- کے۔ایل۔سہگل نے جو مشہور غزلیں اور بھجن گائے ہیں ان کی ایک فہرست بنائیے۔

پڑھیے اور سمجھیے۔

لڑکا گانا گاتا ہے

لڑکی کھانا کھاتی ہے

کسی اسم کا مذکر (نر) یا مونث (مادہ) ہونا جنس کہلاتا ہے۔ مثلاً لڑکا، لڑکی۔

جنس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

(1) جنسِ حقیقی (2) جنسِ غیر حقیقی

ابّا کھانا کھا رہے تھے۔

امّاں کپڑے سی رہی تھیں۔

گھوڑا دوڑ رہا تھا۔

اوپر کے جملوں میں ابّا، امّاں اور گھوڑا یہ اسما جان دار ہیں۔ جان دار اسما کے مذکر مونث ہونے کو جنسِ حقیقی کہتے ہیں۔

دن نکل آیا ہے۔

رات ہوگئی ہے۔

وہ دال کھا رہا ہے۔

اوپر کے جملوں میں دن، رات اور دال غیر حقیقی ہیں۔ بے جان اسما کے مذکر و مونث ہونے کو جنسِ غیر حقیقی کہتے ہیں۔

غور کرنے کی بات

- ہندستانی فلم انڈسٹری میں بہت سے مشہور گانے والے آئے لیکن سہگل کا نام یادگار ثابت ہوا۔ وہ ایک طرح کی افسانوی شخصیت یا لیجینڈ بن گئے ہیں۔ انھوں نے کئی فلموں میں اداکاری بھی کی لیکن ان کی مقبولیت کا بنیادی سبب ان کی گائکی ہے، انھوں نے غزل، گیت، بھجن سب ہی کچھ گایا ہے۔
- ہندستانی فلمی موسیقی کی تاریخ میں سہگل ایک مستقل عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں آج بھی بہت سے لوگ محبت اور عقیدت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔
- اس سبق میں یہ بتایا گیا ہے کہ سہگل نے ہندی فلم کی دنیا میں کس طرح قدم رکھا اور اپنی خود اعتمادی کے بل بوتے پر کس طرح بہت جلد اپنی جگہ محفوظ کر لی۔
- یہ سبق ہندستانی ماس میڈیا کی معروف شخصیت 'جناب شرد دت' کی لکھی ہوئی سہگل کی سوانح عمری سے لیا گیا ہے۔

شبنم

کیا یہ تارے ہیں زمیں پر جو اُتر آئے ہیں
یا وہ موتی ہیں کہ جو چاند نے برسائے ہیں
کیا وہ ہیرے ہیں جو صحرا نے پڑے پائے ہیں
نہ بہت دور پہنچ جائے مری بات کہیں
اپنے آنسو تو نہیں بھول گئی رات کہیں

یہ کہانی بھی سنائی ہے زمیں نے اکثر
کہکشاں جاتی ہے جب پچھلے پہر اپنے گھر
پھینکتی جاتی ہے ہنستی ہوئی لاکھوں گوہر
اور ہر صبح کو یہ کھیل رچا جاتا ہے
ان کو خورشید کی پلکوں سے چنا جاتا ہے

جس طرح باغ کے پھولوں کو چمن پیارا ہے
بن میں جو کھلتی ہیں کلیاں انھیں بَن پیارا ہے
یوں ہی شبنم کو بھی اپنا ہی وطن پیارا ہے
کہکشاں روز بلا کر اسے بہکاتی ہے
پر یہ دامن میں زمیں کے ہی سکوں پاتی ہے

(روش صدیقی)

معنی یاد کیجیے

شبنم	:	اوس
صحرا	:	جنگل
گوہر	:	موتی
خورشید	:	سورج، آفتاب
کہکشاں	:	ستاروں کا جھرمٹ
کھیل رچا جانا	:	کھیل کھیلا جانا
بَن	:	جنگل

سوچیے اور بتائیے۔

1. شاعر کو کن کن چیزوں پر شبنم کا گمان ہوتا ہے؟
2. شبنم کو رات کے آنسو کیوں کہا گیا ہے؟
3. زمین نے شبنم کے بارے میں کیا کہانی سنائی؟
4. کہکشاں پچھلے پہر لاکھوں گوہر پھینکتی جاتی ہے، یہ لاکھوں گوہر کیا ہیں؟
5. خورشید کی پلکوں سے کیا چُنا جا رہا ہے اور یہاں چننے سے کیا مراد ہے؟
6. شبنم اور گوہر کا آپس میں کیا تعلق ہے؟
7. شبنم کے علاوہ اور کس کس کو اپنا وطن پیارا ہے؟
8. شبنم کو زمین کے دامن میں ہی سکون کیوں ملتا ہے؟

مصرعوں کو مکمل کیجیے۔

کیا یہ تارے ....جو .... اُتر .... ہیں
یا وہ موتی .... چاند نے برسائے ....

نہ بہت دور .... جائے مری .... کہیں
اپنے .... تو نہیں بھول ....

نیچے دیے ہوئے لفظوں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

شبنم صحرا کہکشاں خورشید

عملی کام

- نظم میں اپنے پسندیدہ بند کو یاد کر کے لکھیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

اردو میں ''برا'' سے ''برائی'' اور ''بھلا'' سے ''بھلائی'' بناتے ہیں۔ اسی طرح ''خوش'' سے ''خوشی'' اور ''بزدل'' سے ''بزدلی'' بناتے ہیں۔ اسی انداز پر آپ مندرجہ ذیل الفاظ سے اسم بنائیے۔

خوبصورت دوست دشمن خدا اچھا بڑا روشن خیال نوجوان

غور کرنے کی بات

- سورج کی گرمی سے شبنم کی بوندیں غائب ہو جاتی ہیں۔ جسے شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے کہ شبنم کو خورشید کی پلکیں یعنی سورج کی کرنیں چن لیتی ہیں۔
- اس نظم میں شاعر نے شبنم کو تارے، موتی، ہیرے، آنسو اور گوہر قرار دے کر شبنم کی مختلف خصوصیات واضح کی ہیں۔

ابنِ انشا جرمنی میں

انگلستان کو چھوڑ کر یورپ کے جس ملک میں بھی ہم جائیں زبان کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، ہمارے لیے نہیں، اس ملک کے لوگوں کے لیے کیونکہ ہم تو اپنا منشا انگریزی میں بخوبی ادا کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ یہ سچ ہے

کبھی کبھی انگلستان والے بھی ہماری انگریزی سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں لیکن ایسا فقط کبھی کبھی ہوتا ہے۔ لندن میں ہم نے جب کبھی کنگھا خریدنا چاہا، خرید لیا۔ ہمبرگ میں نہیں خرید سکے۔

ہمبرگ میں اس روز بہت تیز ہوا چل رہی تھی اور ہمیں ایک پبلشر سے ملنے شہر سے دور ایک قصبے میں ریل سے جانا تھا۔ ہمبرگ میں عام بڑی ریلوے کے علاوہ دو طرح کی شہری ریلیں چلتی

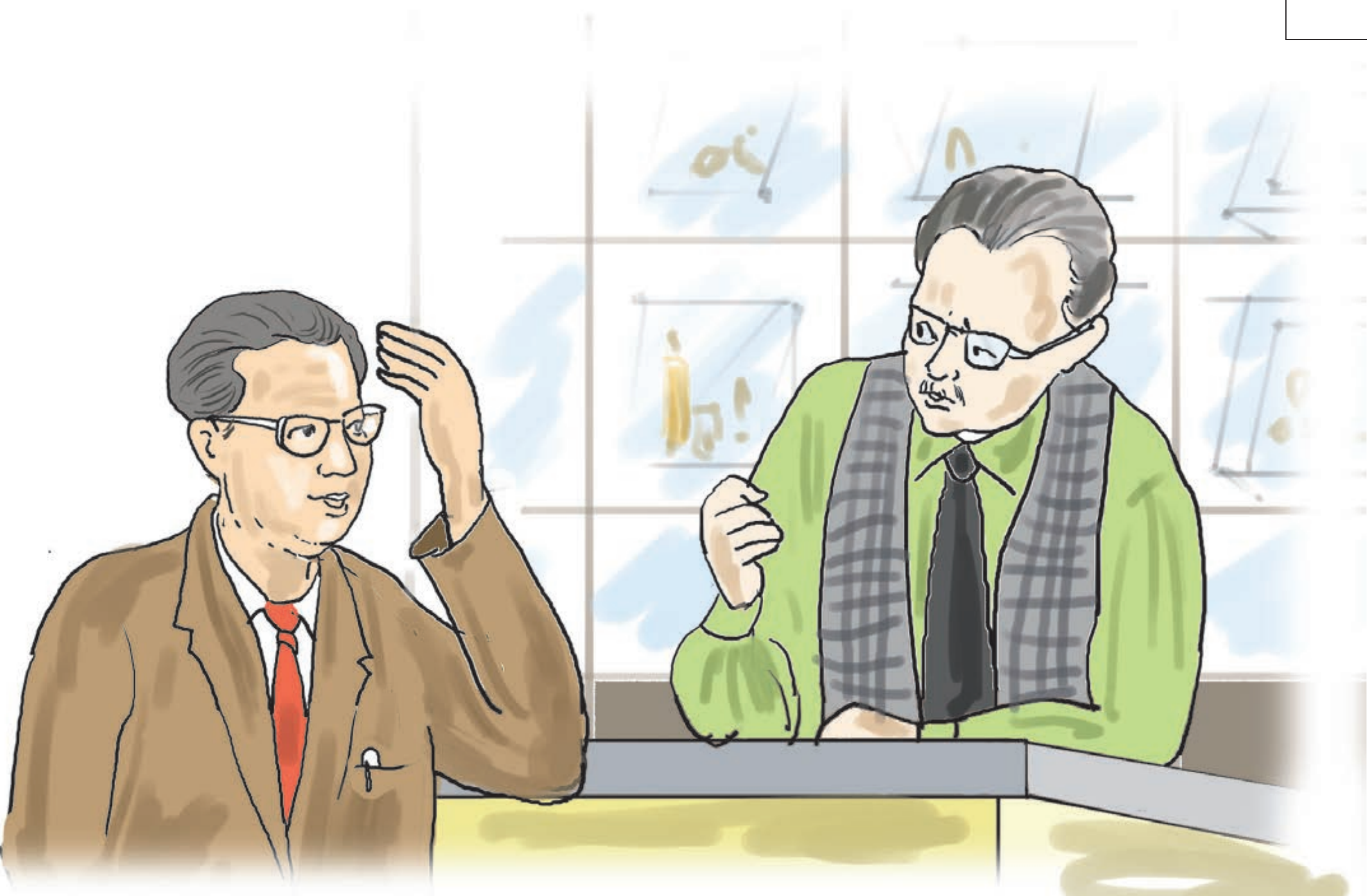

ہیں۔ ایک یو(U)بان یعنی انڈر گراؤنڈ اور دوسری ایس (S) بان یعنی زمین کی سطح سے ایک منزل اوپر چلنے والی۔ ہم نے اپنے سفر نامے، آوارہ گرد کی ڈائری، میں برلن کی S بان کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اس سے ہم اور مولوی محبوب عالم ''پیسہ'' اخبار والے سفر کرتے رہے ہیں۔ وہ 1900 میں، ہم 1967 میں۔ تو یہ ذکر S بان کے اسٹیشن کا ہے۔ اور ہمبرگ میں ہوا کے چلنے کا ہے جس کی وجہ سے ہمارے گیسو بے طرح پریشان ہو رہے تھے۔ ہمیں اپنے دوست مشتاق احمد یوسفی پر رشک آیا کہ کتنی بھی ہوا چلے ان کو ایسے پرابلم پیش نہیں آتے۔ ہمارے ترجمان مسٹر کیدر لین تو ٹکٹ لینے چلے گئے۔ ہم نے ایک دکان پر کنگھا خریدنا شروع کیا اور خریدتے چلے گئے۔

COMB تو خیر وہ کیا سمجھتا۔ ہم نے اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھا کر کے دکھایا۔ اس نے پہلے کریم کی ایک شیشی پیش کی۔ ہم نے رد کر دی تو شیمپو کی ایک ٹیوب دکھائی۔ اس پر ہم نے ہامی نہ بھری تو وہ بالوں کی ایک وِگ دکھانے لگا۔ ہم نے بالوں کی پٹیاں ہاتھ سے جما کر دکھائیں۔ ٹیڑھی مانگ نکالی۔ سیدھی مانگ نکالی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ جانے وہ اپنے کنگھے اور دوسرے سامان کیسے بیچتا ہوگا۔ اتنے میں مسٹر کیدر لین آ گئے اور نہ کوئی لفظ کہا، اور دُکاندار نے جھٹ بہت سارے کنگھے نکال کر سامنے رکھ دیے۔

آج کی سنیے کہ دم تحریر ہم برلن اور ہمبرگ اور میونخ وغیرہ کو بھگتا کر دوبارہ فرنیکفرٹ میں فروکش ہیں۔ اتوار کا دن ہے اور عین اس وقت بھی گرجا کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ صبح اٹھ کر ہم نے شیو کا سامان نکالا اور صابن لگایا۔ بلیڈ تلاش کیے تو ندارد۔ سوٹ کیس کا کونہ کونہ چھان مارا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر صابن پوچھا۔ بال بنائے۔ سوٹ پہنا اور نیچے کونٹر پر گئے اور پوچھا۔ بلیڈ کہاں خریدے جا سکتے ہیں۔ اس بھلے آدمی نے جانے کیا سمجھا۔ بولا ''اچھا تو آپ جا رہے ہیں، آپ کا بل بنا دوں۔'' ہم نے کہا۔ نہیں بھائی۔ ہماری صورت سے اتنے بیزار کیوں ہو رہے ہو۔ ہم فقط شیو کرنا چاہتے ہیں۔ داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بتایا۔ بولا اچھا اچھا۔ لیکن آج تو سب دکانیں بند ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ریلوے اسٹیشن جاؤ اور قسمت آزماؤ۔ غنیمت ہوا کہ یہ ہوٹل جسے ہم ''ہوٹل جینسر گوٹ'' کہتے ہیں کیونکہ اس کا نام ہوٹل شیشر ہوف یاد رکھنے کی اور کوئی ترکیب نہیں۔ اسٹیشن سے فقط پندرہ بیس منٹ کی راہ پر واقع ہے۔ چنانچہ ہم نے صبح کی ٹھنڈ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُدھر کا رخ کیا۔ اس وقت نو بجنے کو تھے۔ لیکن سڑک پر نہ آدم نہ آدم زاد۔ سارا اسٹیشن گھوم گئے۔ مٹھائی کی دکانیں کھلی تھی۔ ناشتے والے تھے۔ اخبار والے تھے۔ تمباکو اور سگریٹ والے تھے۔ لیکن ہمارے مطلب کی چیز بیچنے والا کوئی نہ تھا۔ ہم مایوس ہو رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اچھا داڑھی بڑھا لیں گے۔ آجکل فیشن میں داخل ہے لیکن اتنے میں ایک کولکی نظر آئی۔ کنگھے والے تجربے کی وجہ سے اب کے ہم اپنی زبان دانی پر دھار رکھ کر گئے تھے۔ نہ صرف ڈکشنری سے بلیڈ کا ترجمہ دیکھ لیا تھا BLATT بلکہ یہ بھی یاد کرلیا تھا کہ شیو کرنے کو کیا کہتے ہیں RASIEREN کم پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم رہے کہ ریزر کا لفظ یہیں سے نکلا ہے۔ یا پھر یہ ریزر میں سے نکلا ہوگا۔ وہاں کھڑکی خالی تھی لیکن اتنے میں ایک بڑی بی آ ہی گئیں۔ ہم نے پہلے BLATT کہا۔ پھر RASIEREN اور پھر داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ بولیں ?YOU MEAN BLADE اور بلیڈوں کا پیکٹ اٹھا کر دے دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس بیچاری کو جرمن نہیں آتی تھی۔ صرف انگریزی آتی تھی۔ ہماری طرح دونوں زبانوں پر قادر معلوم نہیں ہوتی تھی۔

کل شام ٹیکسی والے نے ہمارے گتن تاگ کے جواب میں بڑے صحیح مخرج سے گڈ ایوننگ کہا اور پھر انگریزی بولنی شروع کر دی۔ ہم نے کہا میاں خوب انگریزی بولتے ہو۔ ہمارے مقابلے کی نہ سہی پھر بھی خاصی اچھی

ہے۔ بولا۔ جی میں لندن کا رہنے والا ہوں۔ یہاں ٹیکسی چلاتا ہوں۔ انڈیا میں بھی رہا ہوں۔ آپ کہاں کے ہیں؟ ہم نے پاکستان اور کراچی کا نام لیا۔ بولا۔ لاہور بڑا خوبصورت شہر ہے۔ ہم نے کہا، کیسے معلوم ہوا؟ بولا۔ میں چھ سال تک اٹا کی کیمپ میں رہا ہوں جو لاہور اور امرزہ کے درمیان واقع ہے۔ اٹا کی اور امرزہ تو ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ لیکن مزید تفصیل یہ معلوم ہوئی کہ وہ 1920 سے 1926 تک وہاں رہے۔ فوج میں میجر تھے۔ ہم نے کہا (اردو میں) کیا اردو بولتے ہو؟ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ ہم نے انگریزی میں یہی سوال کیا تو بولا۔ ہم آفیسر تھا اور برٹش آرمی میں تھا۔ ہمارا چھوٹا لوگ، سپاہی لوگ NATIVES سے ملتا تھا۔ ہم نہیں ملتا تھا۔ آخر ہم نے کہا۔ تمھارے کیمپ کا نام ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اٹا کی تو کوئی جگہ نہیں، اٹاری ہو شاید۔ بولا، ہاں اٹاری اٹاری۔ امرزہ کے بارے میں بھی ہم نے کہا۔ یہ امرتسر کی خرابی معلوم ہوتا ہے۔ اس نے تصدیق کی۔ یہ میجر تھامس صاحب جورُو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ بس تنہا یہاں رہتے ہیں۔ سال دو سال میں لندن بھی ہو آتے ہیں۔ بولے میرے لیے سب جگہیں برابر ہیں۔ میں انڈیا میں رہا۔ فلسطین میں رہا۔ جرمن جانتا ہوں، فرنچ جانتا ہوں۔ اٹالین جانتا ہوں، ہسپانوی جانتا ہوں، ہم نے کہا۔ اچھا میجر صاحب ہماری منزل آ گئی ہمیں اتاریئے۔ ہم نے میجر صاحب کو تھوڑی سی بخشش بھی دی اور انھوں نے تھینک یو کہا۔

میونخ میں جو بی بی ہمارے پلّے پڑیں وہ بہت شائستہ اور نستعلیق تھیں۔ پلّے پڑنا کا لفظ تو خیر بہت وسیع مفہوم

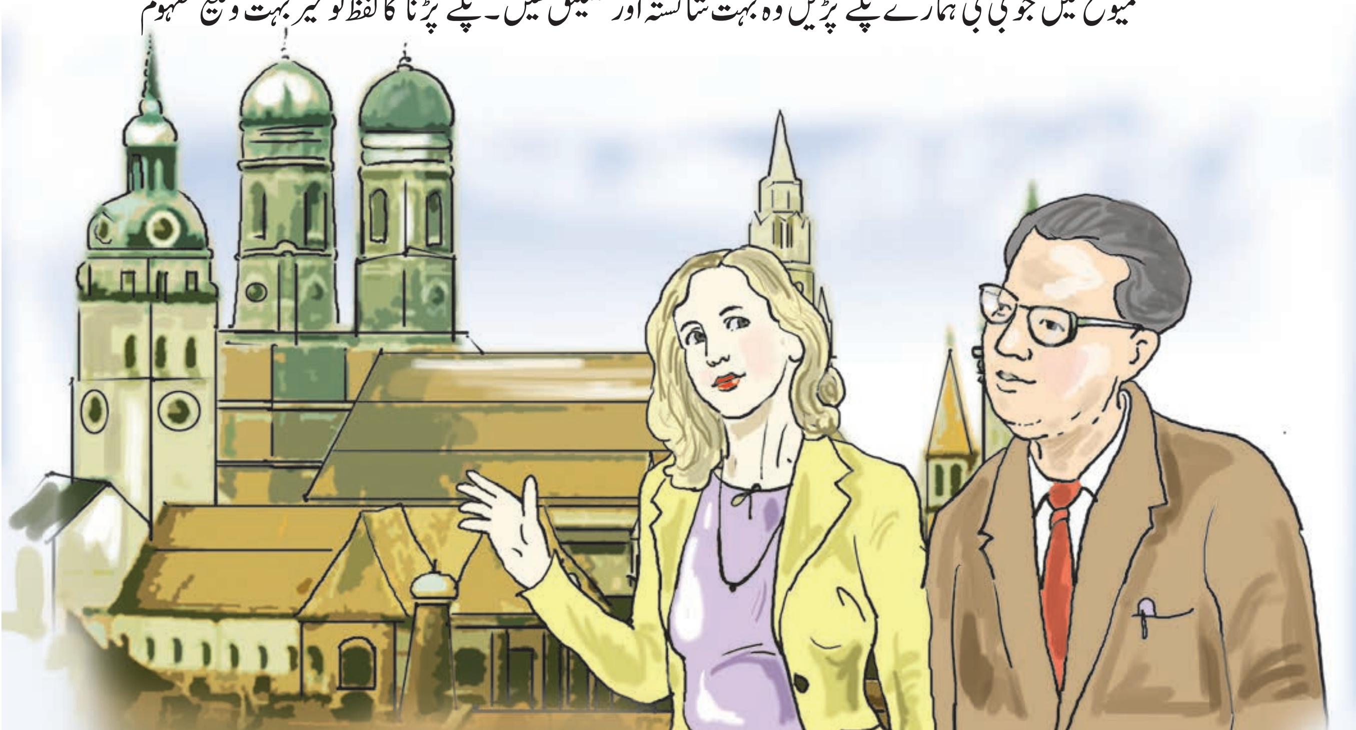

رکھتا ہے اور کئی غلط فہمیوں کو جنم دے سکتا ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ساتھ بطور گائیڈ تھیں اور تو بہت کچھ جانتی تھیں حتیٰ کہ ہمارے ملک کا نام بھی سُن رکھا تھا۔لیکن ہماری زبان کا نام سن کر ہنسیں۔ بولیں۔ اُرندو؟ ہم نے تصحیح کی کہ ارندو نہیں اُردو۔کوئی تین دن کے بعد ان کو یہ نام یاد ہوا۔ ہم نے ان کو مختصر الفاظ میں بتایا کہ کروڑوں آدمیوں کی اس زبان کے عظیم ادب میں ہمارا کیا مقام ہے۔ کیسے ہمیں وہاں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ کیسے ہمارے ملک کی گوریاں ہمارے آنے کی خبر سن کر قطار در قطار کھڑی ہو جاتی ہیں۔ انکسار اچھی چیز ہے لیکن ہر چیز کا حتیٰ کہ انکسار کا بھی کوئی موقع محل ہوتا ہے۔ ہم نے موصوفہ سے کہا۔تم اپنے حساب سے یوں سمجھ لو کہ جیسے جرمن ادب میں گوئٹے ہے کچھ ایسے ہی اردو ادب میں ہم ہیں۔ فیضؔ کے دو تین اشعار کا ترجمہ بھی سنایا کہ یہ ہمارا نمونۂ کلام ہے۔ بہت خوش ہوئیں اور بس انھیں خوش کرنا ہی ہمارا مقصد تھا۔فیضؔ صاحب روس وغیرہ میں ہمارے اشعار اپنے نام سے پڑھ کر رنگ جمانا چاہیں تو ہماری طرف سے اجازت ہے۔

(ابنِ انشا)

معنی یاد کیجیے

فروکش ہونا	:	قیام کرنا، اُترنا
ندارد	:	کسی کا بالکل نہ ہونا
غنیمت	:	بچی ہوئی چیز جو کارآمد ہو
مایوس	:	ناامید
قطار	:	صف، لائن
موصوف	:	جس کی صفت بیان کی جائے
انکسار	:	خاکسار
فیض	:	فائدہ

سوچیے اور بتائیے۔

1. ابنِ انشا کہاں گئے ہوئے تھے؟
2. ابنِ انشا نے کنگھا خریدنے کے لیے کیا کیا اشارے کیے؟
3. ٹیکسی ڈرائیور کون تھا اور وہ کون کون سی زبانیں جانتا تھا؟
4. بڑی بی نے بلیڈ خریدتے وقت ابنِ انشا کی کیا مدد کی؟
5. ابنِ انشا نے میونخ میں خاتون کو کس طرح خوش کیا؟

خالی جگہوں کو صحیح لفظ سے بھریے۔

COMB تو خیر وہ کیا سمجھتا۔ ہم نے بالوں میں انگلیوں سے ....کر کے دکھایا۔ اس نے پہلے ....کی ایک شیشی پیش کی۔ ہم نے رد کر دی تو ....کی ایک ٹیوب دکھائی۔ اس پر ہم نے .... نہ بھری تو وہ بالوں کی ایک ....دکھانے لگا۔ ہم نے ....کی پٹیاں ہاتھ سے جما کر دکھائیں۔ ....مانگ نکالی سیدھی مانگ نکالی۔

نیچے لکھے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

قطار مقصد مقام شائستہ فروخت

واحد سے جمع اور جمع سے واحد بنائیے۔

ترکیب دکان انگلیوں تحریریں راہ مٹھائی زبانوں
خرابی خوبیوں خبر

ان لفظوں کے متضاد الفاظ لکھیے۔

بوڑھا ہوشیار خوش مغرب باقاعدہ

بلند آواز سے پڑھیے۔

مخرج   قادر   موصوف   میونخ   مختصر   فروخت   پبلشر   فروکش

عملی کام

- اپنے کسی سفر کے بارے میں دس سطروں کا ایک پیرا گراف لکھیے۔
- اس سبق میں جن شہروں کا ذکر آیا ہے۔ ان کے نام لکھیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

لیٹنا، چلنا، آنا ایسے فعل ہیں، جن کے لیے مفعول کی ضرورت نہیں، یہ فعلِ لازم کہلاتے ہیں۔ لیکن لیٹنا اور چلنا سے ''لٹانا'' اور ''چلانا'' فعل متعدی بن جاتے ہیں۔ یعنی ان کے لیے مفعول کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مندرجہ ذیل میں سے فعل لازم اور متعدی الگ الگ لکھیے۔

نکلنا   اترنا   بڑھانا   پینا   موڑنا   رونا   مارنا   کٹنا   پھٹنا

غور کرنے کی بات

- ابن انشا اردو کے بہت اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ ان کی نثر نہایت دلچسپ ہوتی ہے۔ انھوں نے کئی مزے دار سفرنامے لکھے ہیں۔ ان کے سفرناموں کو پڑھتے ہوئے دل میں گدگدی بھی پیدا ہوتی ہے۔ ان کا سفرنامہ شروع کرنے کے بعد اسے ختم کیے بغیر چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔
- سفرنامہ ایک ایسی بیانیہ تحریر ہے جو سفر کے دوران یا سفر ختم ہونے کے بعد لکھی جاتی ہے۔ سفرنامہ نگار اپنی ڈائری اور حافظے کی بنیاد پر اپنے سفر کے حالات و واقعات اور تجربات و مشاہدات اس قدر تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے کی معلومات میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔
- اس سفرنامے میں ابنِ انشا نے جرمنی کے سفر کی داستان بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔

جی آیا صاحب

باورچی خانے کی دھندلی فضا میں بجلی کا ایک اندھا قمقمہ چراغِ گور کی مانند اپنی سرخ روشنی پھیلا رہا تھا، دور کونے میں پانی کے نل کے پاس ایک چھوٹی عمر کا لڑکا بیٹھا برتن صاف کرنے میں مشغول تھا۔ یہ انسپکٹر صاحب کا نوکر تھا۔ برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا، یہ الفاظ ایسے تھے جو اس کی زبان سے بغیر کسی کوشش کے نکل رہے تھے۔

جی آیا صاحب، جی آیا صاحب، بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں، صاحب ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد انھیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی تھا اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا۔ لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کیے بغیر آرام یہ کیوں کر ممکن تھا؟

دفعتاً لڑکے نے نیند کے ناقابلِ مغلوب حملے کو محسوس کرتے ہوئے اپنے جسم کو ایک جنبش دی اور جی آیا صاحب، جی آیا صاحب گنگناتا ہوا پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

قاسم! قاسم

جی آیا صاحب'' لڑکا جو انہیں الفاظ کی گردانی کر رہا تھا، بھاگ کر اپنے آقا کے پاس گیا۔

انسپکٹر صاحب نے کمبل سے منھ نکالا اور لڑکے پر خفا ہوتے ہوئے کہا بے وقوف کے بچے آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے۔

''ابھی لایا صاحب، ابھی لایا صاحب''

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی برتن صاف کرنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ پھر اس کمرے سے آواز آئی۔

قاسم! قاسم

جی آیا صاحب، قاسم بھاگتا ہوا اپنے آقا کے پاس گیا۔

بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے۔ جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے کر آؤ بس بھاگے ہوئے جاؤ سخت پیاس لگ رہی ہے۔

''بہت اچھا صاحب۔''

قاسم بھاگا ہوا گیا اور پارسی کے ہوٹل سے جو گھر سے قریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا سوڈے کی بوتل لے آیا اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دے دی۔

''اب تم جاؤ مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو، برتن صاف نہیں ہوئے کیا؟''

''ابھی صاف ہوتے ہیں صاحب۔''

''اور ہاں برتن صاف کرنے کے بعد میرے سیاہ بوٹ کو پالش کر دینا مگر دیکھنا احتیاط رہے۔ چمڑے پر کوئی خراش نہ آئے ورنہ..............''

قاسم کو'' ورنہ'' کے بعد کا جملہ بخوبی معلوم تھا۔'' بہت اچھا صاحب'' کہتے ہوئے وہ باورچی خانے میں واپس

چلا گیا اور برتن صاف کرنے شروع کر دیے۔

اب نیند اُس کی آنکھوں میں سمٹی چلی آ رہی تھی۔ پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں۔ سر میں سیسہ اتر رہا تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے.........صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں۔ قاسم نے اپنے سر کو زور سے جنبش دی اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔

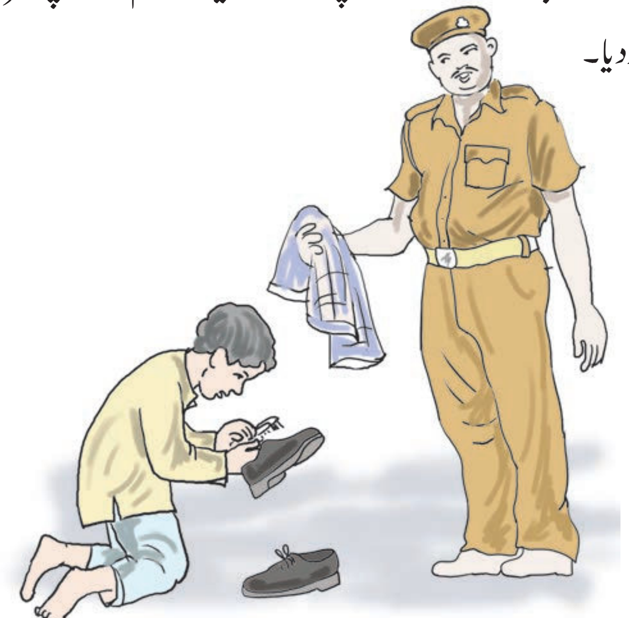

''جی آیا صاحب، جی آیا صاحب! بوٹ ابھی صاف ہو جاتے ہیں۔ صاحب'' مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رُکا۔ اب اسے محسوس ہونے لگا کہ نیند ضرور غلبہ پا کر رہے گی، لیکن ابھی برتنوں کو دھو کر انھیں اپنی اپنی جگہ پر رکھنا باقی تھا۔ اس وقت ایک عجیب خیال اس کے دماغ میں آیا۔ بھاڑ میں جائیں برتن اور چولہے میں جائیں بوٹ کیوں نہ تھوڑی دیر اسی جگہ پر سو جاؤں اور پھر چند لمحات آرام کے بعد..........''

اس کے کان ''بوٹ بوٹ'' کی آوازوں سے گونج اٹھے۔

''بہت اچھا صاحب.........ابھی پالش کرتا ہوں'' بڑبڑاتا ہوا قاسم بستر پر سے اٹھا۔ جیسے اس کے آقا نے ابھی بوٹ روغن کرنے کے لیے حکم دیا ہے۔ ابھی قاسم بوٹ کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا کہ نیند کے غلبے نے اسے وہیں پر سلا دیا۔

صبح جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں بوٹوں کے پاس سویا ہوا دیکھا تو اسے ٹھوکر مار کر جگاتے ہوئے کہا ''یہ سور کی طرح یہاں بے ہوش پڑا ہے اور مجھے خیال تھا کہ اس نے بوٹ صاف کر دیے ہوں گے......نمک حرام......ابے قاسم!''

''جی آیا صاحب''

قاسم کے منھ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میں بوٹ صاف کرنے کا برش دیکھا فوراً ہی اس معاملے کو سمجھتے ہوئے اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: میں سو گیا تھا صاحب مگر......مگر بوٹ ابھی پالش ہوتے ہیں صاحب''، یہ کہتے ہوئے اس نے جلدی جلدی بوٹ کو برش سے رگڑنا شروع کر دیا۔

''قاسم''

''جی آیا صاحب''

قاسم بھاگا ہوا نیچے آیا اور اپنے آقا کے پاس کھڑا ہو گیا۔

دیکھو آج ہمارے یہاں مہمان آئیں گے اس لیے باورچی خانے کے تمام برتن اچھی طرح صاف کر رکھنا، فرش بھی دُھلا ہوا ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ تمھیں ملاقاتی کمرے کی تصویروں، میزوں اور کرسیوں کو بھی صاف کرنا ہوگا۔ سمجھے! مگر خیال رہے میری میز پر ایک تیز دھار چاقو پڑا ہوا ہے اسے مت چھیڑنا! میں اب دفتر جا رہا ہوں مگر یہ کام دو گھنٹے سے پہلے ہو جانا چاہیے۔''

''بہت بہتر صاحب۔''

انسپکٹر صاحب دفتر چلے گئے۔ قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد اس نے باورچی خانے کے تمام کام کو ختم کر دیا اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ملاقاتی کمرے میں چلا گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا اور وقت بہت کم رہ گیا تھا چنانچہ قاسم نے جلدی جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا

شروع کر دیا۔ ابھی وہ کرسیوں کا کام ختم کرنے کے بعد میز صاف کرنے جا رہا تھا کہ اسے یکا یک خیال آیا'' آج مہمان آ رہے ہیں۔ خدا معلوم کتنے برتن صاف کرنے پڑیں گے اور یہ نیند کمبخت کتنا ستا رہی ہے، مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا..........''

یہ سوچتے وقت وہ میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پونچھ رہا تھا کہ اچانک اسے قلمدان کے پاس ایک کھلا ہوا چاقو نظر آیا۔ وہی چاقو جس کے متعلق اس کے آقا نے کہا تھا کہ بہت تیز ہے۔

چاقو کا دیکھنا تھا کہ اس کی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہو گئے چاقو تیز دھار چاقو!........یہی تمہاری مصیبت کو ختم کر سکتا ہے۔''

کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اٹھا اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ اب وہ شام کے وقت برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا اور نیند پیاری پیاری اب اسے با آسانی نصیب ہو سکتی تھی۔

اُنگلی سے خون کی سرخ دھار بہہ رہی تھی۔ سامنے والی دوات کی سُرخ روشنائی سے کہیں چمکیلی۔ قاسم اس خون کی دھار کو مسرّت بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور منہ میں یہ گنگنا رہا تھا، 'نیند نیند' پیاری نیند'' تھوڑی دیر کے بعد وہ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جو زنان خانے میں بیٹھی سلائی کر رہی تھی اور اپنی زخمی انگلی دکھا کر کہنے لگا'' دیکھیے بی بی......ارے قاسم یہ تو نے کیا کیا؟ کمبخت صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہو گا تو نے؟

بی بی جی ......بس میز صاف کر رہا تھا اور اس نے کاٹ کھایا قاسم ہنس پڑا۔

قاسم اپنی فتح پر زیرلب مسکرا رہا تھا۔

اُنگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں آ گیا اور میز پر پڑے ہوئے خون کے دھبّوں کو صاف کرنے کے بعد خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا۔

آقا کی خفگی آنے والی مسرّت نے بھلا دی اور قاسم کودتا پھاندتا ہوا اپنے بستر میں جا لیٹا۔ تین چار روز تک برتن صاف کرنے کی زحمت سے بچا رہا مگر اُس کے بعد اُنگلی کا زخم بھر آیا۔ اب پھر وہی مصیبت نمودار ہو گئی۔

’’قاسم! صاحب کی جرابیں اور قمیضیں دھو ڈالو۔‘‘

’’بہت اچھا بی بی جی۔‘‘

قاسم اس کمرے کا فرش کتنا بدنما ہو رہا ہے۔ پانی لاکر ابھی صاف کرو، دیکھنا کوئی داغ دھبّہ باقی نہ رہے۔‘‘

’’بہت اچھا صاحب۔‘‘

’’قاسم شیشے کے گلاس کتنے گندے ہو رہے ہیں، انھیں نمک سے صاف کرو۔‘‘

’’جی اچھا صاحب۔‘‘

قاسم! طوطے کا پنجرہ کس قدر غلیظ ہو رہا ہے اسے صاف کیوں نہیں کرتے؟‘‘

’’ابھی کرتا ہوں بی بی جی۔‘‘

’’قاسم! ابھی خاکروب آتا ہے تم پانی ڈالتے جانا سیڑھیوں کو دھو ڈالے گا۔‘‘

’’بہت اچھا صاحب۔‘‘

’’قاسم ذرا بھاگ کے ایک آنے کا دہی تو لے آنا۔‘‘

’’ابھی چلا بی بی جی۔‘‘

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اس کے ہاتھ خود بخود چاقو کی طرف بڑھے اور ایک لمحے کے بعد اس کی اُنگلی سے خون بہہ رہا تھا۔ انسپکٹر صاحب اور ان کی بیوی قاسم کی یہ حرکت دیکھ کر بہت خفا ہوئے۔ چنانچہ سزا کی صورت میں اسے شام کو کھانا نہ دیا گیا مگر وہ اپنی ایجاد کردہ ترکیب کی خوشی میں مگن تھا۔ ایک وقت روٹی نہ ملی اُنگلی پر معمولی سا زخم آ گیا مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے نجات مل گئی۔ یہ سودا کچھ برا نہ تھا۔

چند دنوں کے بعد اس کی اُنگلی کا زخم ٹھیک ہو گیا۔ اب پھر کام کی وہ بھرمار شروع تھی۔ پندرہ بیس روز گدھوں سی مشقّت میں گزر گئے۔ اس عرصے میں قاسم نے بار بار ارادہ کیا کہ چاقو سے پھر اپنی اُنگلی زخمی کرے مگر اب میز پر سے وہ چاقو اٹھا لیا گیا اور باورچی خانے والی ’چھری‘ کند تھی۔

ایک بار اس کے آقا نے اسے الماری صاف کرنے کو کہا جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ الماری صاف کرتے وقت اسے داڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ نظر آیا۔ بلیڈ کو پکڑتے ہی اس نے اپنی اُنگلی پر پھیر لیا۔ دھار تھی بہت تیز اور باریک، اُنگلی میں دور تک چلی گئی۔ جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔ قاسم نے بہت کوشش کی کہ خون نکلنا بند ہو جائے مگر زخم کا منہ بڑا تھا وہ نہ تھما۔......سیروں خون پانی کی طرح بہہ گیا۔ یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کاغذ کی مانند سفید ہو گیا۔ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا۔

''بی بی جی میری انگلی میں صاحب کا استرا لگ گیا ہے۔''

''قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے۔''

''وہ کیوں بی بی جی؟''

''یہ صاحب سے دریافت کرنا۔''

چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے گھر آئے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سن کر اسے فوراً

اپنے پاس بلایا۔

''کیوں میاں یہ اُنگلی کو ہر روز زخمی کرنے کے کیا معنی ہیں؟''

قاسم خاموش کھڑا رہا۔

''تم نوکر یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ اندھے ہیں اور ہمیں بار بار دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ اپنا بستر بوریا دبا کر ناک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ہمیں تم جیسے نوکروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ سمجھے۔''

''مگر، مگر صاحب''

''صاحب، کا بچہ۔ بھاگ جا یہاں سے۔ تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائے گا۔ اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔

قاسم روتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ طوطے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ طوطے نے بھی خاموشی میں اس سے کچھ کہا اور اپنا بستر ہ لے کر وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔

خیراتی ہسپتال میں ایک نوخیز لڑکا درد کی شدت سے لوہے کے پلنگ پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ پاس ہی دو ڈاکٹر بیٹھے ہیں۔

ان میں سے ایک ڈاکٹر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا،''زخم خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے، ہاتھ کاٹنا پڑے گا۔''

''بہت بہتر۔''

یہ کہتے ہوئے دوسرے ڈاکٹر نے اپنی نوٹ بک میں اس مریض کا نام درج کر لیا۔ ایک چوبی تختے پر جو چارپائی کے سرہانے لٹکا ہوا تھا مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے۔

نام محمد قاسم ولد عبدالرحمٰن مرحوم

عمر دس سال

(سعادت حسن منٹو)

معنی یاد کیجیے

قمقمہ	:	بلب، قندیل
چراغِ گور	:	قبر پر جلنے والا چراغ
مشغول	:	کام میں لگا ہوا، مصروف
جنبش	:	ہلنا، حرکت
خراش	:	کھرونچ
راگ الاپنا (محاورہ)	:	گانا گانا، اپنی ہی ہانکتے رہنا

لمحات	:	لمحہ کی جمع، پَل
روغن	:	تیل
انتھک	:	نہ تھکنے والا
خفگی	:	ناراضگی
جرابیں	:	جراب کی جمع، موزے
غلیظ	:	گندہ، میلا
خاکروب	:	جھاڑو دینے والا
ادویات	:	ادویہ کی جمع، دوائیں
نوخیز	:	نوعمر
چوبی تختہ	:	لکڑی کا تختہ

سوچیے اور بتائیے۔

1. انسپکٹر صاحب کا رویہ قاسم کے ساتھ کیسا تھا؟
2. قاسم، انسپکٹر صاحب کے ہر حکم پر کیا کہتا تھا؟
3. گھر کا کام قاسم کس ڈھنگ سے کرتا تھا؟
4. قاسم کی نیند کس وجہ سے پوری نہیں ہوتی تھی؟
5. قاسم نے پہلی بار کام سے بچنے کے لیے کیا کیا؟
6. چاقو سے انگلی کٹنے کے بعد بھی قاسم کیوں مسکرایا؟
7. انسپکٹر صاحب نے آخری مرتبہ انگلی کاٹنے پر اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟
8. ڈاکٹروں نے قاسم کے زخم کے بارے میں کیا رائے دی؟
9. چارپائی سے لٹکے ہوئے چوبی تختے پر کیا لکھا تھا؟

صحیح جملوں پر صحیح (✓) اور غلط پر (×) کا نشان لگائیے۔

1. برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا۔ ( )
2. قاسم پارسی کے ہوٹل سے پانی کی بوتل لے آیا اور اپنے آقا کو دی۔ ( )
3. نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رکا۔ ( )
4. انسپکٹر صاحب نے سوتے ہوئے قاسم کو بڑے پیار سے جگایا۔ ( )
5. قاسم نے جلدی جلدی بوٹ کو برش سے رگڑنا شروع کر دیا۔ ( )
6. اچانک قلمدان کے پاس قاسم کو ایک کھلا ہوا چاقو نظر آیا۔ ( )
7. آقا کی بیوی زنان خانے میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ ( )
8. انسپکٹر صاحب نے کہا اپنا بستر بوریا دبا کر ناک کی سیدھ میں بھاگ جاؤ۔ ( )
9. قاسم ہنستا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ ( )
10. خیراتی ہسپتال میں ایک نوخیز لڑکا درد کی شدت سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ ( )

واحد سے جمع اور جمع سے واحد بنائیے۔

فاصلے لمحات حرکت گدھوں دَوا کروٹیں تختہ

ان لفظوں کے متضاد لکھیے۔

ناقابل خفا سیاہ تیز فتح غلیظ

نیچے لکھے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

مشغول جنبش لمحات انتھک غلیظ خفگی نوخیز

نیچے دیے ہوئے جملوں کو کہانی کی ترتیب سے لکھیے۔

1. سوڈے کی بوتل لے آیا اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دے دی۔
2. بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے آؤ۔
3. انسپکٹر صاحب کا نوکر بیٹھا برتن صاف کرنے میں مشغول تھا۔
4. نیند کے غلبے نے اسے وہیں سلا دیا۔
5. بھاڑ میں جائیں برتن اور چولہے میں جائیں بوٹ۔
6. بی بی جی! بس میز صاف کر رہا تھا، اور اس نے کاٹ کھایا۔
7. کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اٹھا کر اپنی انگلی پر پھیر لیا۔
8. زخم خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ ہاتھ کاٹنا پڑے گا۔
9. خیراتی ہسپتال میں ایک نوخیز لڑکا درد کی شدت سے کروٹیں بدل رہا ہے۔
10. نام محمد قاسم ولد عبدالرحمٰن (مرحوم) عمر دس سال۔

عملی کام

- اس کہانی کے کس کردار نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور کیوں؟ مختصر طور پر اپنی زبان میں لکھیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

اس نے الماری کو صاف کیا۔

سلیم کی انگلی زخمی ہوگئی۔

اکرم کے دوست گھر پر آئے۔

اسکول میں کھیل کا میدان تھا۔

اوپر کے جملوں میں کو، کی، کے اور میں ایسے الفاظ ہیں جن کے الگ کوئی معنی نہیں ہیں لیکن یہ دو لفظوں کے درمیان ایسا تعلق قایم

کرتے ہیں کہ یہ اگر نہ ہوں تو سارا جملہ بے ربط ہو جائے۔ قواعد میں انھیں حروف ربط کہتے ہیں۔ یہ دو لفظوں کے درمیان تعلق پیدا کر کے جملوں کو مکمل بناتے ہیں۔ اس سبق سے پانچ جملے تلاش کر کے لکھیے جن میں حروفِ ربط ہو۔

غور کرنے کی بات

- چھوٹے بچوں کو نوکر رکھنا اور ان پر کام کا بوجھ ڈالنا دونوں قانون کی نظر میں جرم ہیں، اور اگر شکایت کر دی جائے تو نوکر رکھنے والے پر جرمانہ اور سزا دونوں ہو سکتی ہیں۔
- کام کی زیادتی نے ہی قاسم کو اپنا ہاتھ زخمی کرنے پر مجبور کیا اور بار بار یہ عمل کرنے کی وجہ سے اس کی نوکری بھی گئی اور ڈاکٹروں نے اس کا ہاتھ کاٹنے کو ہی اس کے حق میں بہتر سمجھا۔
- اس کہانی سے یہ نصیحت ملتی ہے کہ بغیر سوچے سمجھے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو جان لیوا ثابت ہو۔

خوابِ آزادی

اپنی آزادی کا دیکھا خواب میں نے رات کو
یاد کرتا ہوں میں اپنے خواب کی ہر بات کو

میں نے یہ دیکھا کہ میں ہر قید سے آزاد ہوں
یہ ہُوا محسوس جیسے خود میں ''زندہ باد'' ہوں

اب مجھے قانون کا ڈر کیا، مرا قانون ہے
خود ہی کوزہ، خود ہی کوزہ گر وہی مضمون ہے

جتنی تھیں پابندیاں، وہ خود مری پابند ہیں!
وہ جو مائی باپ تھے حاکم وہ سب فرزند ہیں

ملک اپنا قوم اپنی اور سب اپنے غلام
آج کرنا ہے مجھے آزادیوں کو احترام

جس جگہ لکھا ہے مت تھوکو! میں تھوکوں گا ضرور
اب سزاوارِ سزا ہوگا نہ کوئی بھی قصور

اک ٹریفک کے پولیس والے کی کب ہے یہ مجال
وہ مجھے روکے میں رُک جاؤں یہ ہے خواب وخیال

میری سڑکیں ہیں تو میں جس طرح بھی چاہوں چلوں
جس جگہ چاہے رکوں اور جس جگہ چاہے مڑوں

سائیکل کی رات میں بتّی جلاؤں کس لیے
ناز اس قانون کے آخر اٹھاؤں کس لیے

ریل اپنی ہے تو آخر کیوں ٹکٹ لیتا پھروں
کوئی تو سمجھائے مجھ کو یہ تکلف کیوں کروں!

کیوں نہ رشوت لوں کہ جب حاکم ہوں میں سرکار ہوں
تھانوی ہرگز نہیں ہوں اب میں تھانیدار ہوں

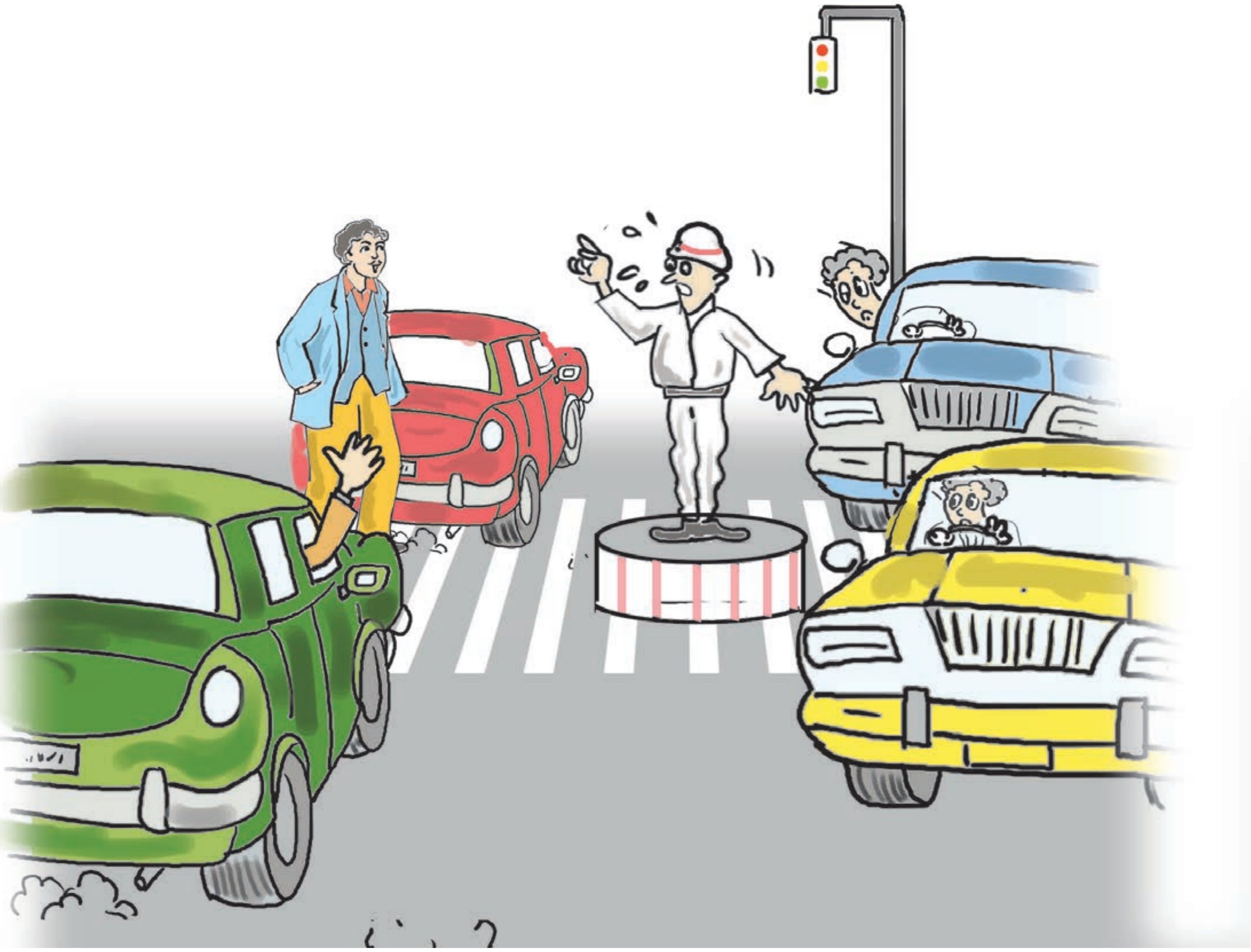

چور بازاری کروں یا شاہ بازاری کروں! مجھ کو حق ہے جس طرح چاہوں میں اپنا گھر بھروں
گھی میں چربی کے ملانے کی ہے آزادی مجھے اب ڈرا سکتی نہیں گاہک کی بربادی مجھے
میں ستم گر ہوں، ستم پیشہ، ستم ایجاد ہوں! مجھ کو یہ حق پہنچتے ہیں سب کہ میں آزاد ہوں
یک بیک جب نیند سے چونکا تو دیکھا یہ حقیر اپنی آزادی ہی کی پابندیوں کا ہے اسیر

(شوکت تھانوی)

معنی یاد کیجیے

کوزہ	:	مٹّی کا پیالہ، کُلّھڑ
کوزہ گر	:	کوزہ بنانے والا (کمہار)
فرزند	:	سزا کے لایق
یک بیک	:	اچانک، یکا یک
حقیر	:	کم تر
اسیر	:	قیدی

سوچیے اور بتائیے۔

1. شاعر نے خواب میں کیا دیکھا؟
2. شاعر کے بے خوف ہونے کی کیا وجہ تھی؟
3. ''خود ہی کوزہ، خود ہی کوزہ گر وہی مضمون ہے'' اس مصرعے میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟
4. شاعر نے اپنے آپ کو تھانے دار کیوں کہا ہے؟
5. چور بازاری اور شاہ بازاری سے کس طرح گھر بھرا جا سکتا ہے؟
6. گاہک کی بربادی گھر میں چربی ملانے سے کیسے ہو سکتی ہے؟
7. نیند سے بیدار ہونے کے بعد شاعر اپنے آپ کو کن پابندیوں میں گھرا پاتا ہے؟

مصرعوں کو مکمل کیجیے۔

ملک اپنا قوم اپنی اور سب اپنے غلام......................

......................اب سزا وارِ سزا ہوگا نہ کوئی بھی قصور

میری سڑکیں ہیں تو میں جس طرح بھی چاہوں چلوں................

.... تھانوی ہرگز نہیں ہوں اب میں تھانیدار ہوں

نیچے لکھے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

احترام　　سزاوار　　رشوت　　چور بازاری　　حقیر

ان لفظوں کے متضاد لکھیے۔

آزادی　　قید　　زندہ باد　　غلام　　اسیر　　بربادی

دار لگا کر لفظ بنائیے۔

ایمان　　عزت　　وفا　　تھانے　　چوکی

عملی کام

- اس نظم کا مرکزی خیال لکھیے اور جو اشعار آپ کو پسند ہوں انھیں یاد کیجیے۔
- چند مزاحیہ شعرا کے کلام کو لائبریری سے حاصل کر کے پڑھیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

ہم نوالہ، ہم مشرب اور ہم خیال وغیرہ مرکّب الفاظ ہیں۔ ان میں ''ہم'' سابقہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح درج ذیل کے لیے مرکب لفظ لکھیے جن کے پہلے ہم استعمال ہو۔

ایک ہی نام کا	=	
ایک ہی مذہب کا	=	
ایک شکل کا	=	
برابر کی عمر کا	=	
ساتھ سفر کرنے والا	=	

غور کرنے کی بات

- اس نظم کے شاعر 'شوکت تھانوی' ہیں جو اپنی ظرافت کے لیے مشہور ہیں۔ مزاحیہ ایسی نظم جس کو پڑھ کر بے اختیار ہنسی یا مسکراہٹ آ جائے اور معاشرے میں پھیلی ہوئی خرابیوں پر چوٹ بھی کی جائے وہ طنزیہ نظم کہلاتی ہے۔
- شوکت تھانوی کا اصل نام محمد عمر تھا۔ وہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ اسی لیے وہ اپنے نام کے ساتھ ''تھانوی'' لگاتے تھے۔ ان کی نظم کا یہ مصرع ع

''تھانوی ہرگز نہیں ہوں اب میں تھانے دار ہوں''

اس لیے بھی دلچسپ ہے کہ اس میں انھوں نے ''تھانوی'' کی رعایت سے لطف پیدا کرنے کے لیے خود کو ''تھانے دار'' کہا ہے۔

حضرت محل

اتر پردیش کی راجدھانی لکھنؤ میں گومتی کے کنارے ایک ہرا بھرا پارک ہے جسے حضرت محل پارک کہا جاتا ہے۔ انگریزوں نے اس مقام کو اپنی فتح کی یادگار قرار دیتے ہوئے وکٹوریا پارک کہا تھا اور جس جگہ سنگِ مرمر کے گنبد کے

نیچے اودھ کی سلطنت کا طُغرا نصب ہے ایک زمانے میں انگلستان کی ملکہ وکٹوریا کا ایک حسین مجسمہ لگا ہوا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وکٹوریہ کے مجسمے کی جگہ ہندوستان کی اُس اولوالعزم ملکہ کا مجسمہ ہی نصب کیا جاتا جس کے نام نامی سے یہ پارک منسوب ہے لیکن مسلمانوں کے مذہبی عقائد کا لحاظ کرتے ہوئے اس پرچم کے نشان کو ہی مناسب سمجھا گیا جس کے سائے میں ارضِ ہند کی اُس غیرت دار خاتون نے بدیسی جبر و استبداد کا دوڈھائی برس جی داری سے مقابلہ کیا اور بجائے ہتھیار ڈالنے کے نیپال کی دشوار گزار گھاٹیوں میں جلاوطنی کی زندگی کو ترجیح دی۔

حضرت محل کا اصلی نام محمدی بیگم تھا۔ وہ اس صاحبِ علم و فضل تاجدار واجدعلی شاہ کی ملکہ تھیں جسے انگریزوں نے عیّاش اور نا اہل قرار دیتے ہوئے فروری 1856 میں معزول کر دیا تھا۔ ان کے چودہ سالہ فرزند برجیس قدر کو نائب مقرر کیا گیا۔ واجد علی شاہ مارچ 1856 میں لندن جانے کے ارادے سے کولکتہ روانہ ہوئے۔ اُنھیں یا کسی کو بھی کیا معلوم تھا کہ ان کی رعایا کا غم و غصّہ سال بھر کی مدّت میں ایک طوفان کی شکل اختیار کر لے گا اور جس پردہ نشین بی بی اور کمسن شہزادے کو خود انگریزوں نے بے ضرر سمجھتے ہوئے آزاد چھوڑ دیا تھا، وہی ان کے خلاف ہتھیار اٹھائیں گے۔

10 مئی 1857 کو میرٹھ چھاؤنی کے ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے شمالی ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت شروع ہوگئی۔ دلّی کے بہادر شاہ، جھانسی کی رانی لکشمی بائی اور اودھ کی بیگم حضرت محل ایسے اشخاص تھے جنھوں نے ان سپاہیوں کی سر براہی کی اور ملک بھر میں جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ مقصد سب کا ایک تھا کہ انگریز ہندوستان سے نکالے جائیں اور اسی لیے اس تحریک کو بغاوت یا غدر کہنا صحیح نہیں، بلکہ برطانوی سامراج سے ٹکّر لینے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ عام طور سے اسے ہندوستان کی ''پہلی جنگ آزادی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت محل کی ان سپاہیوں سے جب پہلی ملاقات ہوئی تو وہ پردے میں تھیں۔ سپاہیوں کا اصرار تھا کہ حضرت محل اپنے اکلوتے بچے برجیس قدر کی تخت نشینی پر رضامند ہو جائیں۔ 5 جولائی 1857 کو برجیس قدر کی تخت نشینی عمل میں آئی اور ان کی ماں راج ماتا اور جناب عالیہ کہی جانے لگیں۔ ان کے تدبّر اور جوشِ عمل نے آزادی کی تحریک میں ایک نئی روح پھونک دی۔

31 جولائی 1857 کو پہلا حملہ مولوی احمد اللہ شاہ کی کمان میں بیلی گارد پر ہوا۔ حملے کے روز حضرت محل کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ حضرت محل کی بہادری اور جوش کا یہ عالم تھا کہ باوجود پردے میں رہنے کے کبھی ہاتھی اور کبھی گھوڑے پر نکلتیں اور لڑنے والوں کی ہمّت افزائی کرتیں۔ عالم باغ کے معرکے میں راجہ مان سنگھ کو ان کی

غیر معمولی شجاعت کے اعتراف میں علاوہ خِلعت کے فرزندِ خاص کا خطاب اور ملبوسِ خاص سے اپنا دوپٹّہ انعام میں دیا اور وعدہ کیا کہ فتح یابی پر اس سے کہیں کچھ بڑھ کر دیا جائے گا۔

میرٹھ، دلّی، کان پور، الہ آباد، گوالیار، جھانسی، کالپی، آگرہ آزادی کی تحریک کے تمام بڑے مراکز انگریزوں کے قبضے میں جا چکے تھے اور اب آخری فیصلہ لکھنؤ میں ہونا تھا جہاں ستّر، اسّی ہزار آدمی بہادری اور استقلال کے ساتھ ڈٹے ہوئے تھے۔ ان کو قومی عزّت کے احساس نے حضرت محل نائب السلطنت کے علم کے نیچے شہر میں جمع کیا تھا۔ ایسے سرفروش مجاہدوں کے مقابل انگریزوں نے جس فوج کو جمع کیا، تعداد اور اہتمام میں ایسا لشکرِ جرّار کبھی ایک محاذ پر یکجا نہ کیا گیا تھا۔

شروع مارچ 1858 کا زمانہ حضرت محل کے لیے بڑی آزمائش کا زمانہ تھا۔ دل کُشا، قدم رسول، بیگم کوٹھی، سکندر باغ، موتی محل، شاہ نجف، قیصر باغ ہر طرف موت کا بازار گرم تھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ سب سے زیادہ حملے کا رُخ چولکھی کی جانب ہے، حضرت محل کسی طرح چولکھی چھوڑنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ ان کے صلاح کاروں نے

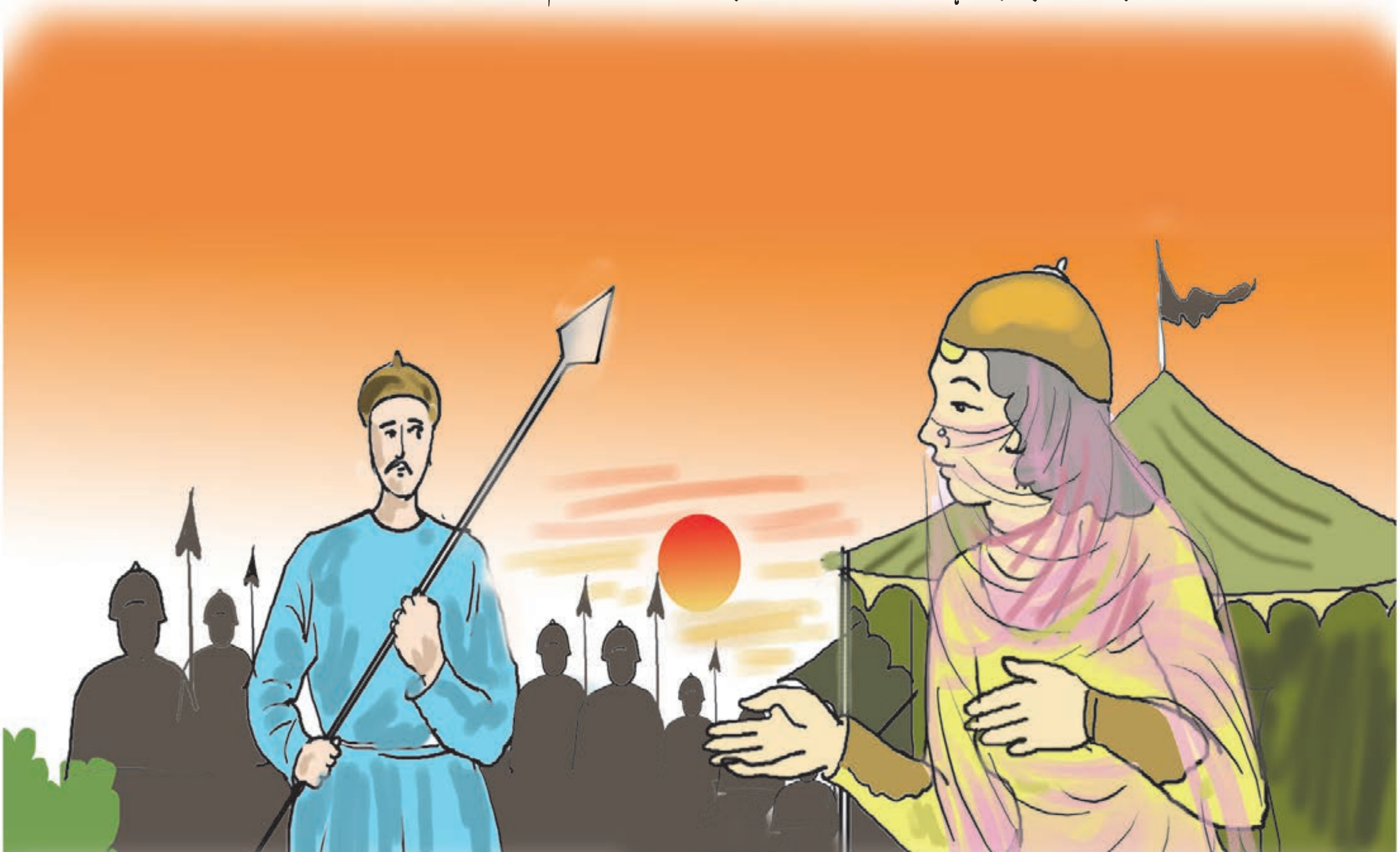

ایک روز انھیں سمجھانے کی کوشش بھی کی، لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا۔ پسپائی اور مخبری کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور جدید ترین اسلحہ سے لیس انگریزی فوجیں شہیدوں اور زخمیوں کو روندتی اپنا پرچم لہراتی چلی آ رہی تھیں۔

حضرت محل کو مُدافعت سے روکنے کی خاطر انگریز سپہ سالار جنرل اوٹرم کی پہلی پیش کش تھی کہ شجاع الدولہ کے زمانے کا اودھ واپس کیا جائے گا، بشرط یہ کہ جنگ موقوف کی جائے۔ جناب عالیہ نے اوٹرم کی پیش کش کو جواب کے قابل بھی نہ سمجھا۔ اوٹرم کا دوسرا صلح نامہ جس میں واجد علی شاہ کی سلطنت واپس کرنے کا وعدہ تھا بشرط یہ کہ جنگ سے باز آئیں، حضرت محل کو اس وقت ملا جب وہ اپنی منتشر فوجوں کو لکھنؤ ہی میں روک لینے کے لیے تھا کہ کسی اور مقام کا رُخ نہ کریں۔ ان کو وہیں گھر بیٹھے پچیس ہزار روپے ماہوار وظیفہ ملے گا۔ حضرت محل نے اس کی بھی پرواہ نہ کی۔

جنگ جیت لینے کے بعد ملکہ وکٹوریا نے عام معافی کا اعلان کیا۔ حضرت محل نے جنگ ہاری تھی، ہمت نہیں ہاری تھی۔ اپنی عارضی فرودگاہ لونڈی سے ہی انھوں نے اپنے جوابی فرمان میں ملکہ وکٹوریا کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور غلامی قبول کرنے کے بجائے برابر لڑتے رہنے اور بے وطنی کی زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی۔

نومبر 1859 کے آخر تک حضرت محل اودھ کی شمالی سرحد سے انگریزی چھاؤنیوں پر چھاپہ مار دستوں کا انتظام کرتی رہیں، لیکن جب تحریک نے دم توڑ دیا تو دونوں ماں بیٹے اپنے بچے کھچے فدائیوں کے ساتھ نیپال چلے گئے۔ ایک مدّت تک انگریزوں کی کوشش رہی کہ وہ واپس آ جائیں۔ ایک انگریز مصوّر جو برجیس قدر کی تصویر کھینچنے گیا تھا، یہ پیغام لے گیا کہ بیگم صاحبہ فیض آباد لکھنؤ جہاں رہنا چاہیں آ جائیں، وظیفے کے علاوہ احترام شاہانہ بھی کیا جائے گا۔ لیکن حضرت محل جب تک زندہ رہیں، نہ خود آئیں اور نہ برجیس قدر ہی واپس آئے۔ کٹھمنڈو کی ہندوستانی مسجد اسی پردیسی ملکہ کی یادگار ہے اور اسی میں ان کی ابدی آرام گاہ ہے۔

(مرزا کوکب قدر)

معنی یاد کیجیے

طغرا	:	خط (تحریر) کی ایک قسم، حکومت کا نشان
نصب کرنا	:	لگانا، گاڑنا
مجسمہ	:	بت
اولوالعزم	:	ہمت، بلند حوصلہ
ارض	:	زمین
جبرواستبداد	:	ظلم وستم
جلا وطنی	:	دیس نکالا، دور دیس بھیج دیا جانا، ملک بدر کیا جانا
عیاش	:	عیش پسند
معزول	:	جسے برطرف کر دیا گیا ہو، جس کا منصب چھین لیا گیا ہو
کمسِن	:	کم عمر
علم	:	جھنڈا، نشان، پرچم
تخت نشینی	:	تخت پر بیٹھنا، بادشاہ ہونا
تدبّر	:	سوجھ بوجھ، ہوشیاری
معرکہ	:	لڑائی
شجاعت	:	بہادری
خلعت	:	خصوصی لباس، پوشاک، بادشاہ یا امیر کی طرف سے دیا جانے والا لباس
ملبوسِ خاص	:	خاص لباس
سرفروش	:	جان ہتھیلی پر رکھنے والا
مستحکم	:	مضبوط، پائدار
لشکرِ جرّار	:	بہت بڑی فوج
محاذ	:	مقابلہ کی جگہ، لڑائی کا میدان

پسپائی	:	پیچھے چلا جانا، پیچھے ہٹنا، ہار جانا
مخبری	:	جاسوسی، ٹوہ میں رہنا
اسلحہ	:	ہتھیار
مُدافعت	:	دفاع کرنا، بچاؤ
فرودگاہ	:	ٹھہرنے کی جگہ
ترجیح دینا	:	برتر سمجھنا، فوقیت دینا
احترام شاہانہ	:	شاہی مرتبے کے مطابق احترام
ابدی آرام گاہ	:	آخری آرام گاہ، مراد، قبر

سوچیے اور بتائیے۔

1. حضرت محل کون تھیں اور ان کا اصلی نام کیا تھا؟
2. حضرت محل پارک کو پہلے کیا کہا جاتا تھا؟
3. انگریزوں کے خلاف ہتھیار ہندوستانی سپاہیوں کی قیادت کس نے کی؟
4. حضرت محل نے راج مان سنگھ کو کیا اور کیوں انعام دیا؟
5. آزادی کی تحریک کے بڑے مراکز کون کون سے تھے اور وہ کس کے قبضے میں تھے؟
6. حضرت محل کی آخری آرام گاہ کہاں پر ہے؟

صحیح جملوں پر صحیح (✓) اور غلط پر غلط (×) کا نشان لگائیے۔

1. حضرت محل کا اصلی نام محمدی بیگم تھا۔ ( )
2. 10 مئی 1857 کو ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ ( )
3. حضرت محل پردہ نشین خاتون نہیں تھیں۔ ( )
4. حضرت محل نے حملے کے ڈر سے چولکھی کو چھوڑ دیا۔ ( )

5. جنگ جیت لینے کے بعد ملکہ وکٹوریا نے عام معافی کا اعلان نہیں کیا۔ ( )
6. حضرت محل نے ملکہ وکٹوریا کی پیش کش کو قبول کر لیا۔ ( )
7. دونوں ماں بیٹے اپنے فدائیوں کے ساتھ نیپال چلے گئے۔ ( )
8. کٹھمنڈو کی ہندوستانی مسجد میں حضرت محل کی ابدی آرام گاہ ہے۔ ( )

نیچے لکھے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

منسوب جبر واستبداد خطاب سرفروش لشکرِ جرار پیش کش صلح نامہ

ان لفظوں کے متضاد لکھیے۔

فتح آزادی جدید عارضی پائیدار

نیچے لکھے لفظوں کی جمع لکھیے۔

خاتون عقیدہ تحریک معرکہ خطاب مرکز مجاہد

عملی کام

- ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصّہ لینے والی پانچ خواتین کے نام لکھیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

”حضرت محل کی ان سپاہیوں سے جب ملاقات ہوئی تو وہ پردے میں تھیں۔“
”سپاہیوں کا اصرار تھا کہ حضرت محل اپنے اکلوتے بیٹے برجیس قدر کی تخت نشینی پر رضامند ہو جائیں۔“
”ان کے صلاح کاروں نے ایک روز انھیں سمجھانے کی کوشش بھی کی لیکن ان کے استقلال میں فرق نہیں آیا۔“

اوپر کے ان جملوں میں جب، کہ، اور، لیکن وغیرہ دو جملوں کو جوڑتے ہیں۔ لفظ یا جملوں کو جوڑنے والے لفظ کو ''حرفِ عطف'' کہتے ہیں۔

''ہندوستانی مسجد میں ان کی ابدی آرام گاہ ہے۔''

آرام + گاہ = آرام گاہ یہاں دو اسموں کو ملا کر ایک مرکب اسم بنایا گیا ہے آپ بھی ایسے پانچ مرکب اسم لکھیے جو گاہ کے ساتھ بنائے گئے ہوں۔

غور کرنے کی بات

- بیگم حضرت محل کا اصلی نام محمدی بیگم تھا وہ واجد علی شاہ کی ملکہ تھیں۔ انگریزوں نے بادشاہ کو عیاش اور نااہل قرار دیتے ہوئے معزول کر دیا تھا۔ واجد علی شاہ کے بیٹے برجیس قدر جو کم سن بچے تھے۔ ان کی 5 جولائی 1857 کو تخت نشینی کر دی گئی اور ان کی ماں راج ماتا اور جناب عالیہ کہی جانے لگیں۔
- بیگم حضرت محل پردہ نشین خاتون تھیں اس کے باوجود وہ انگریزوں سے برابر لڑتی رہیں۔ انھوں نے صلح کی ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا اور جنگ ہارنے کے بعد بھی انگریزوں کی غلامی قبول کرنے کے بجائے بے وطنی کی زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی۔
- انھوں نے اپنی شجاعت، دلیری، اور وطن دوستی سے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستانی خواتین بھی کسی سے کم نہیں اور وطن عزیز کی آبرو کی خاطر ہر قربانی دینے کو وہ تیار رہتی ہیں لیکن دشمن کے سامنے جھکنا انھیں منظور نہیں۔

وطن کی طرف واپسی

(مہاتما گاندھی)

اب مجھے جنوبی افریقہ میں آئے تین سال ہو چکے تھے۔ میں یہاں کے لوگوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا اور یہ

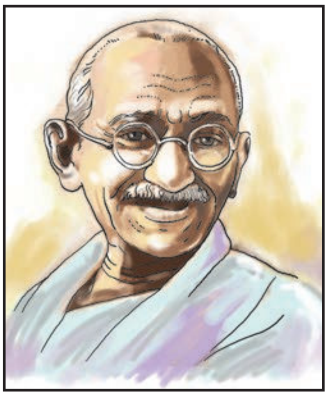

بھی مجھے خوب جان گئے تھے۔ 1896 میں میں نے ان سے چھ مہینے کے لیے اجازت مانگی کیوں کہ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ مجھے جنوبی افریقہ میں بہت دن رہنا ہے۔ میری وکالت اچھی خاصی چلتی تھی اور مجھے احساس ہو گیا تھا کہ لوگوں کو میری ضرورت ہے۔ اس لیے میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ گھر جا کر بیوی بچے لے آؤں اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لوں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ وطن جا کر لوگو ں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے واقف کراؤں اور یہاں کے ہندوستانیوں کا ہمدرد بناؤں تو کچھ قومی خدمت بھی ہو جائے گی۔ تین پاؤنڈ کا محصول ہمارے جسم میں ناسور کی طرح تھا۔ جب تک یہ دور نہ ہو جائے ہمیں چین نہیں آ سکتا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ میرے پیچھے کانگریس اور تعلیمی انجمن کا کام کون سنبھالے؟ میری نظر میں دو شخص تھے۔ آدم جی میاں خاں اور پارسی رستم جی۔ یوں تو ہمیں اب تاجروں کے حلقے سے بہت سے کارکن مل سکتے تھے لیکن ان لوگوں میں جو سکریٹری کے فرائض باقاعدہ انجام دے سکتے تھے، جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں میں عزّت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، سب سے ممتاز یہی دو حضرات تھے۔ ظاہر ہے کہ سکریٹری کے لیے کام چلانے بھر کی انگریزی جاننا ضروری تھا۔ میں نے کانگریس میں آدم جی میاں خاں (جو اب انتقال کر چکے ہیں) کا نام پیش کیا اور وہ سکریٹری مقرّر کر دیے گئے۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ انتخاب بہت موزوں تھا۔ آدم جی میاں خاں کے استقلال،

فیاضی، مُروّت اور اخلاق سے سب لوگ خوش تھے اور ہر شخص پر یہ ثابت ہو گیا کہ سکریٹری کے کام کے لیے ایسے شخص کی ضرورت نہیں جس نے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی ہو یا انگلستان میں اعلیٰ تعلیم پائی ہو۔

میں 1896 کے وسط میں پنگولا جہاز سے جو کلکتے جا رہا تھا، وطن روانہ ہوا۔ جہاز پر بہت کم مسافر تھے۔ ان میں سے دو انگریز افسر تھے جن سے مجھ سے بہت بے تکلّفی ہو گئی۔ ان میں سے ایک کے ساتھ میں روزانہ ایک گھنٹے شطرنج کھیلا کرتا تھا۔ جہاز کے ڈاکٹر نے مجھے ایک کتاب دی جس کا نام تھا ''بے مُعلّم کے تامل (تمل) سکھانے والی''۔ میں نے اس کتاب کو باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے نٹال میں تجربے سے یہ معلوم ہوا تھا کہ مجھے مُسلمانوں سے خلا ملا پیدا کرنے کے لیے اُردو اور مدراسیوں سے میل جول رکھنے کے لیے تامل سیکھنا چاہیے۔

میرا ایک انگریز دوست بھی میرے ساتھ اُردو پڑھتا تھا۔ اس کی فرمائش سے میں نے تیسرے درجے کے مسافروں میں ایک اُردو کا 'منشی' ڈھونڈ نکالا اور ہم دونوں کی خوب پڑھائی ہونے لگی۔ اس انگریز کا حافظہ مجھ سے بہت اچھا تھا۔ وہ جو لفظ ایک بار دیکھ لیتا تھا، کبھی نہیں بھولتا تھا۔ مجھے اکثر اُردو حروف کے پہچاننے میں دقّت ہوتی تھی۔ میں نے بہت زور لگایا مگر اس کے برابر کبھی نہیں پہنچ سکا۔

تامل میں میں نے خاصی ترقّی کی۔ کوئی پڑھانے والا نہ ملا لیکن کتاب بہت اچھی لکھی ہوئی تھی اور

مجھے امید تھی کہ ہندوستان پہنچنے کے بعد بھی یہ مطالعہ جاری رکھ سکوں گا مگر یہ بالکل ممکن تھا۔ 1893 کے بعد سے اب تک میں نے جو کچھ پڑھا ہے زیادہ تر جیل جانے میں پڑھا ہے۔ جو تھوڑی بہت تامل اور اُردو مجھے آتی ہے وہ میں نے جیل میں ہی سیکھی ہے۔ تامل جنوبی افریقہ کی جیل میں اور اُردو یرودا جیل میں۔ مگر تامل بولنا مجھے کبھی نہ آیا اور پڑھنے کی مشق بھی اب چھوٹتی جاتی ہے۔

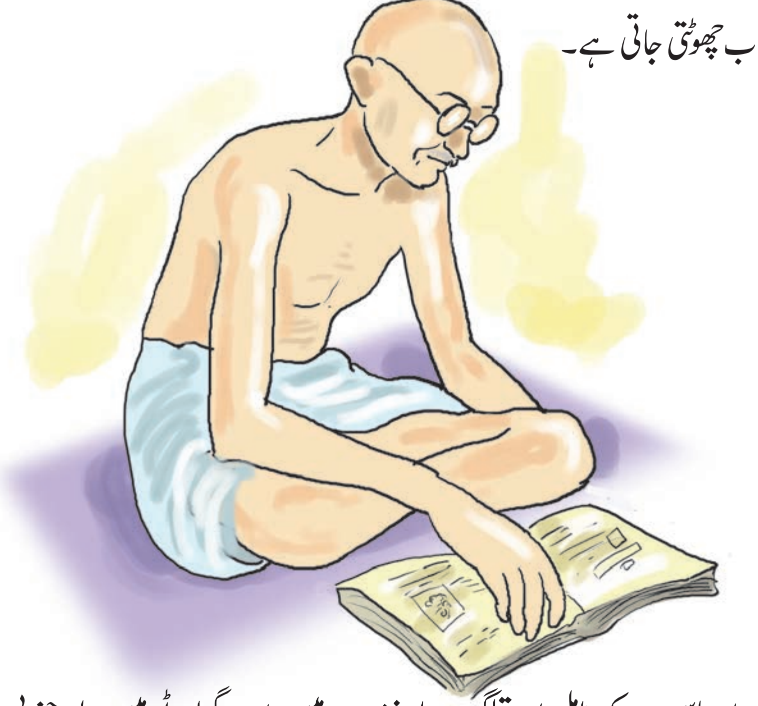

مجھے اب تک یہ احساس ہے کہ تامل اور تیلگو نہ جاننے سے میں بڑے گھاٹے میں رہا۔ جنوبی افریقہ کے دراوڑیوں نے میرے ساتھ جس محبت کا اظہار کیا تھا اس کی یاد مجھے اب تک عزیز ہے۔ جب کبھی کوئی تامل یا تیلگو دوست نظر آتا ہے تو مجھے بے اختیار اس کے ہم وطنوں کی عقیدت، استقلال، ایثار اور بے نفسی کا خیال آ جاتا ہے جن کا میرا جنوبی افریقہ میں ساتھ تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ مرد ہوں یا عورت، ان پڑھ تھے۔ جنوبی افریقہ کی لڑائی انھیں لوگوں کے لیے تھی اور یہی ان پڑھ سپاہی اس میں لڑتے تھے۔ غریبوں ہی کے لیے یہ لڑائی تھی اور غریب ہی اس میں دل و جان سے شریک تھے۔ ان کی زبان نہ جاننے سے اور چاہے جو نقصان ہوا ہو مگر اپنے ان نیک اور بھولے ہم وطنوں کا دل مُٹھّی میں لینے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ لوگ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی اور انگریزی

بول لیتے تھے اور ہمارا کام بغیر کسی دقت کے چلتا تھا۔لیکن میں تامل اور تیلگو سیکھ کر ان کی محبت کا معاوضہ ادا کرنا چاہتا تھا۔تامل تو میں نے تھوڑی بہت سیکھ بھی لی مگر تیلگو میں، جس کے سیکھنے کی میں نے ہندوستان میں کوشش کی الف ب سے آگے نہ بڑھ سکا۔اب میں غالبًا یہ زبانیں کبھی نہ سیکھ سکوں گا۔اس لیے میری ساری اُمّید اسی پر منحصر ہے کہ دراوڑی ہندوستانی سیکھ لیں گے۔جنوبی افریقہ میں ان میں سے جو لوگ انگریزی نہیں جانتے وہ ہندی یا ہندوستانی،ٹوٹی پھوٹی سہی مگر بول لیتے ہیں۔البتہ انگریزی جاننے والے اسے نہیں سیکھنا چاہتے۔گویا انگریزی جاننا خود اپنی زبانوں کے سیکھنے میں سدّ راہ ہے۔

چوبیس دن کے بعد یہ خوشگوار سفر ختم ہو گیا اور میں دریائے ہُگلی کے حسن پر سر دُھنتا ہوا کلکتے پہنچ گیا۔اسی دن میں ریل میں بیٹھ کر بمبئی روانہ ہو گیا۔

(مہاتما گاندھی کی آپ بیتی سے)

(مترجم:سیّد عابد حسین)

معنی یاد کیجیے

محصول	:	ٹیکس
ناسور	:	نہ بھرنے والا زخم
تاجروں	:	تاجر کی جمع،تجارت کرنے والا
کارکن	:	کام کرنے والا
فرائض	:	فرض کی جمع
ممتاز	:	دوسروں میں نمایاں
فیاضی	:	دوسروں کو فیض پہنچانا،سخاوت
مُروّت	:	دوسروں کا خاص خیال رکھنا

مشق : کسی کام کو بار بار کرنا
بے نفسی : اپنے کو کچھ نہ سمجھنا
ایثار : قربانی
معاوضہ : اُجرت، یہاں مراد ہے بدلہ

سوچیے اور بتایئے۔

1. گاندھی جی جنوبی افریقہ میں کیا کام کرتے تھے؟
2. جہاز کے سفر میں گاندھی جی کی کن لوگوں سے دوستی ہوئی؟
3. گاندھی جی نے اردو زبان سیکھنے کے لیے کس سے مدد لی؟
4. جنوبی افریقہ کی لڑائی کن لوگوں کے لیے تھی؟

خالی جگہ کو صحیح لفظ سے بھریے۔

1. میری وکالت............خاصی چلتی تھی۔
2. یہاں کے ہندوستانیوں کا ہمدرد بناؤں تو............قومی خدمت............ہو جائے گی۔
3. جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں میں ....کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔
4. میرا ایک انگریز.............بھی..........ساتھ اردو پڑھتا تھا۔
5. مجھے اُمّید تھی کہ ہندوستان پہنچنے کے بعد بھی یہ مطالعہ جاری رکھ سکوں گا.........یہ بالکل ناممکن تھا۔
6. ....ہی کے لیے یہ لڑائی تھی اور غریب ہی اس میں ....شریک تھے۔

نیچے دیے ہوئے لفظوں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

عزّت اخلاق عزیز عقیدت خوشگوار معاوضہ

واحد سے جمع اور جمع سے واحد بنائیے۔

تاجروں　　کارکُن　　ہم وطنوں　　نقصان　　اختیارات　　خیال　　امید

بلند آواز سے پڑھیے۔

استقلال　　تعلیمی　　موزوں　　انگلستان　　مُعلّم　　مُطالعہ　　معاوضہ　　منحصر
عقیدت　　اخلاق　　درواڑی

عملی کام

- لائبریری سے مہاتما گاندھی کی آپ بیتی ''تلاشِ حق'' نکلوائیے اور اس کا مطالعہ کیجیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

اقبال گھر سے آیا

اکرم نے سبق یاد کیا

اوپر کے جملوں میں '' سے اور نے'' لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ وہ لفظ جن کی مدد سے جملے بنتے ہیں حرفِ جار کہلاتے ہیں۔ پانچ جملے اس سبق سے چنیے جن میں حرفِ جار استعمال ہوا ہو۔

غور کرنے کی بات

- موہن داس کرم چند گاندھی کی پیدائش پوربندر (گجرات) میں 1869 میں ہوئی تھی۔ انھوں نے لندن سے بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر کے جنوبی افریقہ کے شہر نٹال (NATAL) میں وکالت شروع کی۔ یہاں انگریزوں کی حکومت تھی۔ جنوبی افریقہ میں انگریز مقامی سیاہ فام لوگوں اور وہاں آباد ہندوستانی لوگوں پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے۔ ان لوگوں کو بہت سے علاقوں میں

داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ سواریوں کے اعلیٰ درجے میں سفر کرنے سے بھی انھیں روکا جاتا تھا۔ انھیں طرح طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں اور ان پر ناجائز جرمانے لگائے جاتے تھے۔

- گاندھی جی نے نٹال شہر میں سادہ زندگی کی مثال قائم کرنے کے لیے ٹالسٹائے فارم بنایا اور وہاں کے سیاہ فام باشندوں اور ہندوستانی لوگوں کو متحد کر کے حکومت کے خلاف ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی۔
- 1915 میں گاندھی جی ہندوستان واپس آئے اور اپنے ملک کی آزادی کے لیے عوام کو متحد کر کے ایسی تحریک چلائی کہ ہمارا ملک 1947 میں انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو گیا۔ 30 جنوری 1948 کو گاندھی جی کی شہادت ہوئی۔ ان کی سمادھی دلی میں جمنا کے کنارے راج گھاٹ پر واقع ہے۔
- گاندھی جی نے عدم تشدد (اہنسا) کا جو سبق دیا اس کی اہمیت آج کے دور میں پہلے سے زیادہ محسوس کی جاسکتی ہے۔

فلسطینی بچے کے لیے لوری

(ان بچّوں کے نام جن کے ماں باپ، بھائی بہن اپنے ملک
کی آزادی کی جدو جہد میں شہید ہوئے ہیں)

مت رو بچے
رو رو کے ابھی
تیری امّی کی آنکھ لگی ہے
مت رو بچے
کچھ ہی پہلے
تیرے ابّا نے
اپنے غم سے رخصت لی ہے

مت رو بچے
تیرا بھائی
اپنے خواب کی تتلی پیچھے
دور کہیں پردیس گیا ہے
مت رو بچے
تیری باجی کا
ڈولا پرائے دیس گیا ہے

مت رو بچے
تیرے آنگن میں
مردہ سُورج نہلا کے گئے ہیں
چندر ما دفنا کے گئے ہیں
مت رو بچے
امّی ، ابّا ، باجی ، بھائی
چاند اور سوُرج

تو گر روئے گا تو یہ سب
اور بھی تجھ کو رُلوائیں گے
تو مسکائے گا تو شاید
سارے اک دن بھیس بدل کر
تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے

(فیض احمد فیضؔ)

معنی یاد کیجیے

غم سے رُخصت لینا	:	رخصت یعنی اجازت، یہاں مراد ہے غم سے نجات پا لینا
ڈولا	:	پردیس، بڑی ڈولی
چندرما	:	چاند
گر	:	اگر کی مختصر شکل
مسکانا	:	مسکرانا
بھیس بدلنا (محاورہ)	:	شکل بدلنا

سوچیے اور بتایئے۔

1. ''تیری امی کی آنکھ لگی ہے'' اس مصرعے میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟
2. نظم میں ''پردیس'' جانے سے کیا مراد ہے؟
3. شاعر نے سُورج اور چاند کن لوگوں کو کہا ہے؟
4. بچّے کے مسکرانے کا کیا اثر ہوگا؟
5. کن لوگوں کے بھیس بدل کر لوٹ آنے کی بات کہی گئی ہے؟

نیچے لکھے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

پردیس ڈولا آنگن رخصت بھیس لوٹ

ان لفظوں کے متضاد لکھیے۔

غم پردیس رونا پرایا دن

ان لفظوں کے مذکر بنائیے۔

امّاں　　رانی　　مینا　　بہن　　لڑکی　　بیٹی

پڑھیے اور سمجھیے۔

ڈولا۔ پردہ نشیں عورتوں کی سواری جو چھوٹی پلنگڑی کے چاروں کونوں میں بانس لگا کر جھؤ لے جیسی بنائی جاتی ہے۔ اسے ایک لمبی سی بلّی یا موٹے بانس میں چھینکے کی طرح لٹکاتے ہیں اور دو آدمی جنھیں کہار کہتے ہیں، اس لکڑی کے دونوں سرے جو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر چلتے ہیں۔ یہ سواری چھوٹی ہو تو ڈولی اور بڑی ہو تو ڈولا کہلاتی ہے۔ ڈولا شادی بیاہ میں کام آتا ہے اس میں دلہن کو بٹھا کر رخصت کرتے ہیں۔ پینس اور پالکی بھی ڈولی ہی کی قسمیں ہیں۔ ان میں عورتوں کے علاوہ مرد بھی بیٹھا کرتے تھے اب یہ سواریاں بہت کم استعمال ہوتی ہیں۔

غور کرنے کی بات

- اس نظم میں فلسطین کی جنگِ آزادی میں شہید ہونے والوں کو یاد کیا گیا ہے۔ بچے کے ماں، باپ، بھائی اور بہن سب شہید ہو چکے ہیں۔ شاعر بچے کو تسلّی دے رہا ہے اور مسکرانے کی تلقین کر رہا ہے۔ یہاں شاعر نے بڑے خوبصورت انداز میں ہر ایک کی شہادت کا ذکر کیا ہے۔ ماں کے لیے شاعر کہتا ہے کہ تیری امّی کی آنکھ لگی ہے آنکھ لگنا سے مراد یہاں ابدی نیند سونا ہے۔ اسی طرح ابّا کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ تیرے ابّا نے غم سے رخصت لی ہے۔ مرنے کے بعد انسان کو خوشی اور غم کا کوئی شعور نہیں رہ جاتا اس لیے شاعر کہتا ہے کہ ان کے غم اب ختم ہو گئے ہیں۔ بھائی کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ وہ دور کہیں پردیس گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ انتقال کر کے اس دنیا سے چلا گیا ہے۔ اسی طرح بہن کے بارے میں کیا کہتا ہے کہ اس کا ڈولا پرائے دیس گیا ہے۔ یہاں بھی مراد دیس سے مراد دوسری دنیا یعنی عاقبت ہے۔
- اس نظم میں سورج اور چاند کو استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ فلسطین کی جنگِ آزادی میں جو شہید ہوئے یہاں انھیں فلسطینی شہیدوں کو چاند اور سورج کہا گیا ہے۔
- اس نظم کا پیغام یہ ہے کہ اگر ہم وطن کی راہ میں شہید ہونے والوں کی موت کو خوشی سے قبول کر لیں تو وہ شہید ہونے والے ہماری اپنی ہستی میں پھر سے زندہ ہو جاتے ہیں اور ان کی جدائی کا غم دؤر ہو جاتا ہے۔

رفیع احمد قدوائی

رفیع احمد قدوائی کا شمار ہندوستان کے مشہور رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ وہ مادرِ وطن کے ایک سچے، بے لوث اور بہادر سپوت تھے۔ 18 فروری 1894 کو بمقام مسولی، ضلع بارہ بنکی، خاں صاحب شیخ امتیاز علی کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم رواج کے مطابق گھر پر ہوئی۔ پھر گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ بارہ بنکی سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے۔ علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے کہ تحریکِ ترکِ موالات میں حصّہ لینے کے باعث ایک سال کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔ یہیں سے اُن کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

اُنھوں نے پنڈت موتی لال نہرو کی رہنمائی اور جواہر لال نہرو کی رفاقت میں سیاسی تربیت پائی اور انگریزوں کے خلاف مختلف سیاسی تحریکوں میں حصّہ لیا۔ یو پی کی مقامی سیاست کے سرگرم کارُکن رہے۔ 1942 کی ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک میں پیش پیش رہے۔ رفیع صاحب ملک وقوم کی خاطر پانچ مرتبہ جیل گئے۔

جب ہندوستان آزاد ہوا تو رفیع صاحب پہلے وزیرِ مواصلات اور اس کے بعد وزیرِ غذا بنائے گئے۔ اُن کی شخصیت بڑی جاندار تھی۔ وہ اکثر خطرات میں گھرے، اُنھیں مایوسیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن اُنھوں نے کبھی شکست قبول نہیں کی اور نہ اُن کے عزم و استقلال میں کوئی فرق آیا۔ قدوائی صاحب عملی انسان تھے، وہ عمل پر یقین رکھتے تھے اور کام کو انجام تک پہنچانے میں اپنی انتہائی کوششیں صرف کر دیتے تھے۔

وزیرِ مواصلات کی حیثیت سے رفیع صاحب نے رات کی ہوائی ڈاک کا سلسلہ شروع کیا۔ اُس وقت یہ ایک بہت مشکل کام تھا۔ اسی طرح اُنھوں نے ڈاکیوں کو اتوار کی چھٹّی دلوائی۔ یہ بھی کوئی معمولی کام نہ تھا۔ کیونکہ

ڈاک کا کام چوبیس گھنٹے جاری رہتا ہے۔ ایک دن کی چھٹّی سے بھی اس کا نظام درہم برہم ہوسکتا تھا، لیکن رفیع صاحب نے ایسا انتظام کیا کہ ڈاکیوں کو اتوار کے دن چھٹّی ملنے کے باوجود ڈاک کا انتظام معمول کے مطابق چلتا رہا۔

حکومتِ ہند میں وزیرِ غذا بن جانے کے بعد رفیع صاحب نے راشننگ کا خاتمہ کیا۔ بہت سے ماہرین نے کہا تھا کہ راشننگ ہٹانے کی پالیسی پر عمل کیا گیا تو ملک تباہی کے غار میں جا گرے گا۔ قدوائی صاحب جانتے تھے کہ ملک میں غلّہ کافی ہے اور کچھ بڑے بیوپاریوں نے اسے گوداموں میں ذخیرہ کر رکھا ہے۔ قدوائی صاحب نے ''زیادہ اناج اُگاؤ'' کی تحریک شروع کی جس کی وجہ سے ملک میں اناج کی پیداوار میں اضافہ ہوا اور جو غلّہ بیوپاریوں نے چھپا دیا تھا وہ قدوائی صاحب کی چلائی ہوئی مہم کی بدولت بازار میں آ گیا۔ اس طرح اُنھوں نے راشننگ اُٹھانے کے تجربے کو کامیاب کر دکھایا۔

رفیع احمد قدوائی کی شادی اُن کے خاندان میں ہی ہوئی تھی۔ بیوی بڑی نیک دل، دین دار اور عبادت گُزار تھیں۔ اُن کے انتقال سے ایک سال پہلے رفیع صاحب نے انھیں حج بھی کروایا۔

رفیع صاحب کی زندگی تمام تر سادہ رہی۔ وہی موٹے کپڑے کی معمول شیروانی اور پاجامہ۔ سوٹ اور ہیٹ کو چھُوا تک نہیں ۔ کپڑے کسی اونچے ٹیلر ماسٹر کی دُکان سے نہیں بلکہ گھر سے سل کر آتے تھے۔ سرکاری کوٹھی اور فرنیچر جیسا بھی شاندار ہو، اُن کے اپنے گھر کو کوئی جا کر دیکھتا تو حیرت میں پڑ جاتا۔ ٹوٹا پھوٹا سا پُرانی وضع کا مکان جو اتنے بڑے منسٹر تو کیا کسی ماتحت عہدے دار کے بھی شایانِ شان نہیں ہوسکتا۔ انتقال کے بعد اُن کی میّت میں شرکت کے لیے جو غیر ملکی شخصیتیں مسولی پہنچی تھیں انھیں یقین نہیں آتا تھا کہ اتنے بڑے منسٹر کا مکان اتنا معمولی بھی ہوسکتا ہے۔

رفیع صاحب بچپن ہی سے ملنسار تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ اپنے دوستوں، ہم جماعتوں اور ساتھیوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے، جس میں مالی مدد بھی شامل ہے۔ اُن کا سارا روپیہ دوستوں کی ضرورتوں پر یعنی اُن کی فیس کی ادائیگی، اُن کی کتابوں کے خریدنے پر، اُن کے علاج معالجے پر اور مختلف ضرورتوں پر خرچ ہوتا تھا۔ جب اُن کے پاس روپیہ نہیں ہوتا تھا اور کوئی دوست مشکل میں ہوتا تو وہ بذریعۂ تار اپنے چچا سے روپیہ منگواتے تھے اور اس کی مدد کرنے کی یہ خصوصیت مرتے دم تک قائم رہی۔ اِنتقال کے بعد بینک میں ان کے نام معمولی رقم نکلی۔

جس آدمی سے جس طرح ایک بار ملے، بس عمر بھر اسی طرح ملتے رہے۔ غرور انھیں چھو تک نہیں گیا تھا۔ خلوت میں، جلوت میں، اندر، باہر کہیں بھی ملتے، یہ کبھی بھی معلوم ہی نہ ہونے پاتا کہ ملاقات کسی وزیر سے ہو رہی ہے۔ وضعداری کی ایک یادگار مثال یہ بھی ہے کہ عیدین کی نماز پابندی سے اپنے وطن مسولی ہی میں آکر پڑھتے تھے۔ یوپی میں زمینداری کا خاتمہ ہوا۔ اسے ختم کروانے میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔ یہ بھی ایک چھوٹے سے زمیندار تھے۔ اپنی زمینداری کو بچالے جانا ان کے لیے کیا مشکل تھا، مطلق کوئی تدبیر نہ کی۔ اپنے عہدے سے اپنی ذات کے لیے کبھی ادنیٰ فائدہ اُٹھانے کا سبق اُنھوں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ سوتیلی والدہ زندہ تھیں۔ ایک روز اُنھوں نے فرمایا:

''رفیع! زمینداری تو خوب ختم کر دی۔ اب گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟ خاندان بھوکوں مرے گا۔ سب کا انتظام کیا لیکن اپنے گھر کے لیے کچھ نہ کیا۔''

رفیع صاحب ہنس کر بولے: ''امّاں جان! آپ گھبراتی کیوں ہیں۔ زمینداری ختم ہو جانے سے کیا ہوتا ہے۔ میں کُھر پالے کر گھاس چھیلوں گا، آپ گٹّھا بنا کر بیچیے گا۔ سب کی روٹی چل جائے گی۔''

دشمنوں سے اس طرح ملتے کہ جیسے دوستوں سے ملا جاتا ہے۔ دوستوں سے یوں برتاؤ کرتے جیسے عزیزوں سے کیا جاتا ہے اور عزیزوں کو اپنی جان کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ کوئی ان سے کام نکالنا چاہتا یا کسی کو اُن سے ضرورت آپڑتی تو انھیں یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ اپنا کون ہے اور بیگانہ کون۔ مقصود انھیں صرف کام کر دینا ہوتا تھا اور اس وقت ہر ایک ان کا اپنا ہوتا تھا۔ بیگانہ کوئی بھی نہ رہتا۔ خلق اللہ کی خدمت وہ عبادت کی طرح کرتے تھے اور خدمت کرنے میں انھیں وہی مزہ آتا جو دوسروں کو خدمت لینے میں آتا ہے۔

قدوائی صاحب سرتاپا عمل تھے اور ہر وقت عملی سرگرمیوں میں منہمک۔ اس کے باوجود خشک ذرا نہ تھے۔ ہر وقت خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ بہت سویرے اُٹھتے اور اُسی وقت سے ان کا کام شروع ہو جاتا۔ دنوں کا کام گھنٹوں میں اور گھنٹوں کا کام منٹوں میں چُکا دیتے۔ کھڑے ہو کر اور ٹہلتے ہوئے بیٹھے ہوئے یا لیٹے ہوئے ہر حال میں کام ہی کرتے ہوئے پائے جاتے تھے۔

رفیع صاحب کا ساٹھ سال کی عمر میں 1954 میں انتقال ہوا۔ لیکن بے لوث اور شاندار خدمات کی بدولت ان کا نام رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ آج بھی مرحوم کے شاندار کارناموں اور بیش بہا خدمات کی وجہ سے ملک کے

کروڑوں باشندوں کے دلوں میں اُن کی یاد تازہ ہے۔ جب بھی ملک کسی ایسی بڑی مشکل سے دو چار ہوتا ہے جس کا حل تقریباً ممکن ہوتو مرحوم کا نام زبانوں پر بے ساختہ آتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اگر مرحوم اس وقت ہوتے تو یہ مسئلہ کبھی کا حل ہو چکا ہوتا۔

(عبدالماجد دریابادی)

معنی یاد کیجیے

بے لوث	:	بے غرض
وزیرِ مواصلات	:	اطلاعات ونشریات، ڈاک، تار، ریڈیو کا نظام
عزم	:	پختہ ارادہ
سرتاپا	:	سر سے پاؤں تک
استقلال	:	ثابت قدمی
رفاقت	:	دوستی
درہم برہم	:	تتر بتر
ذخیرہ	:	گودام، رکھی ہوئی چیز
غلّہ	:	اناج کا ذخیرہ
خلوت	:	تنہائی
جلوت	:	مجلس
وضعداری	:	رکھ رکھاؤ، ایک ہی وضع پر قائم رہنا
کُھرپا	:	گھاس کھودنے کا آلہ
خلق	:	اللہ کے بندے
منہمک	:	پوری توجہ کے ساتھ
زیرِ تعلیم	:	تعلیم حاصل کرنے والا، پڑھائی کرنے والا
مطلق	:	بالکل
شایانِ شان	:	مرتبے کے لحاظ سے
سپوت	:	نیک بیٹا

سوچیے اور بتائیے۔

1. رفیع احمد قدوائی کون تھے؟
2. رفیع احمد قدوائی کی سیاسی زندگی کا آغاز کیسے ہوا؟
3. رفیع احمد قدوائی نے کن رہنماؤں سے سیاسی سے تربیت پائی؟
4. رفیع احمد قدوائی ملک وقوم کی خاطر کتنی بار جیل گئے؟
5. وزیر مواصلات کی حیثیت سے رفیع احمد قدوائی نے کیا کیا اصلاحات کیں؟
6. رفیع احمد قدوائی کا سب سے اہم کارنامہ کیا تھا؟
7. قدوائی صاحب لوگوں سے کس طرح پیش آتے تھے؟
8. رفیع احمد قدوائی کا انتقال کب ہوا؟

نیچے لکھے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

عزم رفاقت درہم برہم غلّہ وضعداری

ان لفظوں کے متضاد لکھیے۔

بہادُر ابتدا نیک دوست ادنیٰ

واحد سے جمع اور جمع سے واحد بنائیے۔

قوم بازار شخصیات ضرورت عزیزوں خدمت

بلند آواز سے پڑھیے۔

خلق اللہ بیش بہا وضعداری مطلق شایانِ شان غلّہ درہم برہم
مواصلات ترکِ موالات عزم واستقلال بےلوث

عملی کام

- رفیع احمد قدوائی صاحب کی شخصیت کے بارے میں دس جملے لکھیے۔

پڑھیے اور سمجھیے۔

''ریگستان میں اونٹ سواری اور بار برداری کے کام آتا ہے۔''

اوپر کے جملے میں پوری بات کہی گئی ہے۔ جب جملہ پورا ہوتا ہے تو اس طرح کا نشان (۔) لگایا جاتا ہے۔ اسے ''ختمہ'' کہتے ہیں۔

''کسی کا مقابلہ اس سے زیادہ طاقت ور، بڑے یا زبردست سے ہو تو اس کی بڑائی کا بھرم کھل جاتا ہے۔''

اس جملے میں ''طاقت ور'' کے بعد تھوڑا اٹھہرنا پڑتا ہے۔ یہ ٹھہرنا کم وقفے کا ہوتا ہے جسے اس نشان (،) سے ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ''سکتہ'' کہلاتا ہے۔

بڑی بہن نے کہا: ''محمود، جب تم اڑنا سیکھ لو تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلنا۔''

اس جملے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ بڑی بہن نے کیا کہا، جب کسی شخص کی کہی ہوئی بات اس کے الفاظ میں لکھی جائے تو بات کے شروع اور آخر میں یہ نشان ('' '') لگا دیتے ہیں۔ ان نشانات کو ''واوین'' کہتے ہیں۔ بڑی بہن نے کہا کہ بعد جو نشان (:) لگایا گیا ہے اسے رابطہ کہتے ہیں۔ یہ سبھی نشانات رموزِ اوقاف کہلاتے ہیں۔

غور کرنے کی بات

- رفیع احمد قدوائی ہندوستان کے ایک عظیم رہنما تھے۔ تحریکِ آزادی میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ وہ مادرِ وطن کے ایک سچے بے لوث اور بہادر سپاہی تھے۔ انھوں نے اہلِ وطن کی بہترین رہنمائی کی۔ رفیع احمد قدوائی صاحب نیک سیرت انسان تھے۔
- رفیع احمد قدوائی صاحب کی پوری زندگی قومی اتحاد، سیکولرازم، وطن پرستی کی چاہ میں گزری۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے قدوائی صاحب نے انگریزی حکومت کی مخالفت کی جس کے نتیجے میں پانچ بار جیل گئے۔ اُن کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ اُن کا لباس اور رہن سہن نہایت سادہ تھا۔ قدوائی صاحب کی زندگی جد و جہد، سادگی، خودداری، قلندری، بے باکی، اصول پسندی اور حق گوئی کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ قدوائی صاحب کی زندگی ایک محبِ وطن کی کھری اور سچی مثال ہے۔

قرۃ العین حیدر

قرۃالعین حیدر کی ولادت 20 جنوری 1928 کو علی گڑھ میں ہوئی۔ ان کے والد سیّد سجاد حیدر یلدرم اور والدہ نذر

سجاد حیدر دونوں معروف لکھنے والے تھے۔قرۃالعین حیدر کو ادب کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ یلدرم اور نذر سجاد حیدر کے بزرگ 1857 میں مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد سرسید کی تحریک میں شامل ہوئے۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے ہندوستانی مسلمانوں میں وہ پیش پیش تھے۔ 1920 میں جب سرسید کا کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا تو یلدرم اس کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ انھوں نے ترکی زبان سے کئی ترجمے اردو میں کیے اور کچھ کہانیاں بھی لکھیں۔ نذر سجاد حیدر شادی سے پہلے 'بنتِ نذرالباقر' کے نام سے بچوں کے رسالوں 'پھول' اور 'تعلیم نسواں' میں کہانیاں لکھتی تھیں۔ ان کا پہلا ناول 'اختر النسا بیگم' صرف چودہ سال کی عمر میں لکھا گیا اور لاہور سے چھپا تھا۔

قرۃالعین حیدر کی ابتدائی زندگی کے چند سال جزیرہ پورٹ بلیئر میں گزرے۔ ان دنوں یلدرم وہیں تعینات تھے۔ ابتدائی تعلیم دہرہ دون میں ہوئی۔لکھنؤ کے مشہور ازابیلا تھوبرن کالج سے بی۔اے۔کی ڈگری حاصل کی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے 1947 میں انگریزی ادب میں ایم۔اے۔کیا۔صرف گیارہ سال کی عمر میں قرۃالعین حیدر نے بچوں کے لیے پہلی کہانی لکھی جو 'بی چوہیا' کے عنوان سے 1937 میں رسالہ 'پھول' (لاہور) میں شائع ہوئی۔ پانچ سال بعد دوسری کہانی 'یہ باتیں' لاہور ہی کے مشہور رسالہ 'ہمایوں' میں چھپی۔

1947 میں ملک تقسیم ہوا۔قرۃالعین حیدر پاکستان چلی گئیں جہاں کراچی میں ان کے بہت سے عزیز آباد ہو

گئے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے لندن میں بی بی سی ریڈیو پر بھی کام کیا اور کچھ دستاویزی فلمیں بھی بنائیں۔ 1959 میں ان کا مشہور ناول 'آگ کا دریا' چھپا اور اس کی مخالفت ہوئی تو دل برداشتہ ہو کر ہندوستان واپس چلی آئیں۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں وہ انگریزی رسالوں 'امپرنٹ' اور 'السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا' کی ادارت سے وابستہ رہیں۔

قرۃ العین حیدر اردو کی ممتاز ترین ناول نگار ہیں۔ ان کا پہلا ناول 'میرے بھی صنم خانے' 1949 میں چھپا تھا۔ اس کے علاوہ 'سفینۂ غمِ دل'، 'آگ کا دریا'، 'آخر شب کے ہم سفر'، 'گردش رنگِ چمن' اور 'چاندنی بیگم' ان کے معروف ناول ہیں۔ تین جلدوں پر مشتمل سوانحی ناول 'کارِ جہاں دراز ہے' بھی ان کی یادگار ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'ستاروں سے آگے' 1947 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد تین مجموعے 'شیشے کے گھر'، 'پت جھڑ کی آواز' اور 'روشنی کی رفتار' چھپے اور بچوں کے لیے کہانیاں 'لومڑی کے بچے'، 'بہادر'، 'میاں ڈھینچو کے بچے'، 'شیر خاں' اور 'ہرن کے بچے' وغیرہ بھی لکھی تھیں۔ ان سے متعلق خطوں کا مجموعہ 'دامانِ باغبان' کے نام سے اور ان کے اہلِ خاندان' دوستوں اور ہم عصروں' کی تصویروں کا البم کفِ گل فروش بھی شائع ہو چکا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'داستانِ عہدِ گل' ہے۔ انگریزی اور ہندی میں ان کی کتابوں کے متعدد ترجمے شائع ہوئے ہیں۔

1967 میں ادبی خدمات کے لیے قرۃ العین حیدر کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا۔ دو سال تک انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی اردو کی وزیٹنگ پروفیسر کے فرائض انجام دیے۔ حکومت ہند نے انھیں 'پدم شری' اور 'پدم بھوشن' کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ 1990 میں قرۃ العین حیدر کی خدمات کے اعتراف میں ملک کا سب سے ممتاز ادبی انعام 'گیان پیٹھ' دیا گیا۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور افسانوں میں زیادہ تر قدیم مشترکہ تہذیب کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد اس تہذیب کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ ان کے قصوں کے اکثر کردار لکھنؤ کی اس مہذب اور

شاعرانہ فضا سے متعلق تھے جو ہندو یا مسلمان ہونے کے باوجود ایک مشترکہ نظام زندگی میں یقین رکھتے تھے۔ ہندوستان کی تقسیم قرۃالعین حیدر کے یہاں ایک ہولناک انسانی المیے کے طور پر سامنے آتی ہے۔ بلا شبہ قرۃالعین حیدر اردو فکشن کا سب سے اہم نام ہے۔ اپنی زندگی کے آخری تیس برس انھوں نے دلّی یا دلّی کے آس پاس گزارے۔ 21 اگست 2007 کو نوئیڈا میں قرۃ العین حیدر کا انتقال ہوا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں دفن ہوئیں۔

معنی یاد کیجیے

ولادت	:	پیدائش
معروف	:	مشہور، جانا پہچانا
تعینات	:	مقرر
دل برداشتہ	:	مایوس
دستاویزی فلم	:	وہ فلم جس کی بنیاد حقیقی واقعات پر ہو
ادارت	:	اخبار یا رسالے کی ترتیب کا کام
سوانحی ناول	:	وہ ناول جس میں حالاتِ زندگی کا بیان ہو
رپورتاژ	:	کسی آنکھوں دیکھے واقعے کا ادبی انداز میں تذکرہ
وزیٹنگ پروفیسر	:	مہمان پروفیسر
اعتراف	:	ماننا، تسلیم کرنا
مشترکہ تہذیب	:	رہنے سہنے کا ایک جیسا طریقہ
عکاسی	:	عکس یا تصویر اتارنا
مہذب	:	تہذیب یافتہ

سوچیے اور بتائیے۔

1. قرۃ العین حیدر کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی تھی؟
2. قرۃ العین حیدر کے والدین کے نام لکھیے۔
3. سجّاد حیدر یلدرم علی گڑھ میں کس عہدے پر فائز تھے؟
4. قرۃ العین حیدر کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی؟
5. قرۃ العین حیدر نے پہلی کہانی کس عمر میں لکھی؟
6. قرۃ العین حیدر کا مشہور ناول 'آگ کا دریا' کس سنہ میں شائع ہوا؟
7. قرۃ العین حیدر کو کون کون سے اعزاز ملے؟
8. قرۃ العین حیدر کا انتقال کب ہوا؟

خالی جگہ کو صحیح لفظ سے بھریے۔

1. قرۃ العین حیدر کی پیدائش ....میں ہوئی تھی۔
2. قرۃ العین حیدر کی ابتدائی تعلیم ....میں ہوئی۔
3. کہانی 'بی چوہیا' رسالہ............میں شائع ہوئی تھی۔
4. ناول 'آگ کا دریا' سال............میں شائع ہوا تھا۔
5. قرۃ العین حیدر کو 1990 میں ملک کا سب سے بڑا انعام ....دیا گیا۔
6. قرۃ العین حیدر ....میں دفن ہوئیں۔

نیچے دیے ہوئے لفظوں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

ولادت   ترجمہ   ڈگری   ناول   تہذیب

یاد رکھیے۔

پورٹ بلیئر جزائر انڈمان نکوبار کی راجدھانی ہے۔

عملی کام

- قرۃ العین حیدر کے بارے میں دس جملے لکھیے۔
- قرۃ العین حیدر کی کہانیاں لائبریری سے حاصل کر کے پڑھیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

صحت بخش	صحت دینے والا
زندگی بخش	زندگی دینے والا

ان دونوں لفظوں میں صحت اور زندگی دو اسموں کو 'بخش' کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ دونوں لفظ اسمِ فاعل ہیں۔ ''بخش'' جیسے لفظوں کو جو تنہا استعمال نہیں ہوتے ''لاحقہ'' کہتے ہیں۔

دار (جیسے ایمان دار) مند (جیسے عقل مند) اور ''گار'' (جیسے خدمت گار) بھی لاحقے ہیں۔ ہر ایک سے بننے والے تین تین لفظ لکھیے۔

غور کرنے کی بات

- قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور افسانوں میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے۔ مشترکہ تہذیب سے ہندوستان کی وہ تہذیب مراد ہے جس کی تشکیل میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہوتے تیوہاروں اور شادی بیاہ کی تقریبات اور مختلف رسموں میں جوش و خروش کے ساتھ حصّہ لیتے اور ہر موقعے پر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ سب کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے خلوص اور پیار کا جذبہ موجود تھا۔ قرۃ العین حیدر نے اسی مشترکہ تہذیب کی تصویریں پیش کی ہیں۔

- قرۃالعین حیدر کے افسانوں اور ناولوں میں تہذیب و تاریخ، علوم اور فنون کا عمل دخل بہت نمایاں ہے۔ ان کی فکری سطح بھی بہت بلند ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے انسانی وجود اور انسانی صورتِ حال سے متعلق تمام بنیادی مسئلوں کا احاطہ فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بیسویں صدی کی سب سے بڑی ہندوستانی فکشن نگار تھیں۔

یہ ہے میرا ہندستان

یہ ہے میرا ہندستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

ہنستا گاتا جیون اس کا، دھوم مچاتے موسم
گنگا جمنا کی لہروں میں سات سُروں کا سرگم
تاج ایلورہ جیسے سُندر تصویروں کے البم
یہ ہے میرا ہندستان

بادل جھومے، برکھا برسے، پون جھکولے کھائے
دھرتی کے پھیلے آنگن میں یوں کھیتی لہرائے
جیسے بچّہ ماں کی گود میں رہ رہ کے مُسکائے

یہ ہے میرا ہندستان

راجہ رانی، گڈّا گڈّی اور پریوں کی کہانی
بچّوں کے جھُرمٹ میں سنائے بیٹھ کے بوڑھی نانی
لوری گائے، ماتھا چومے، ممتا کی دیوانی

یہ ہے میرا ہندستان

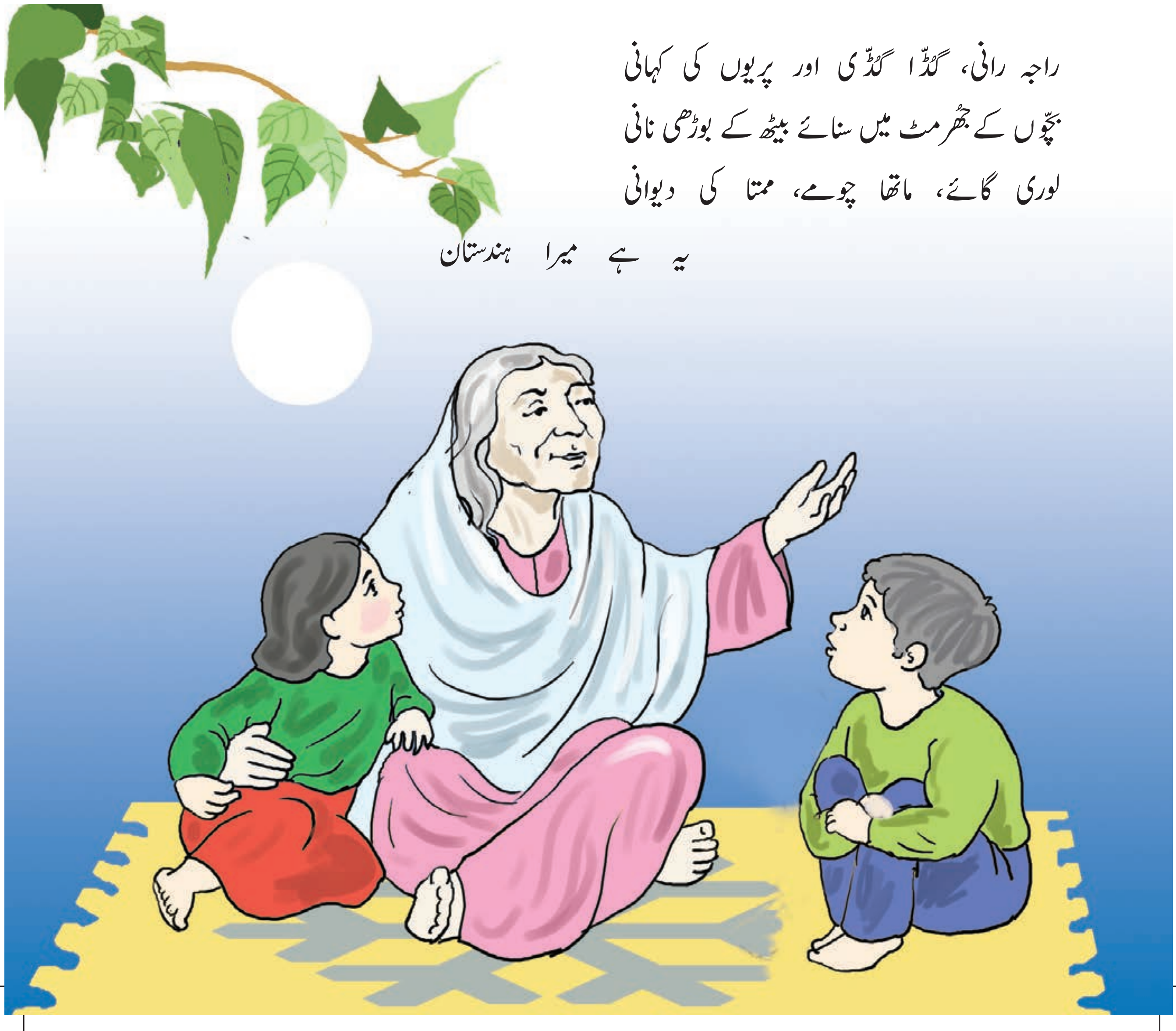

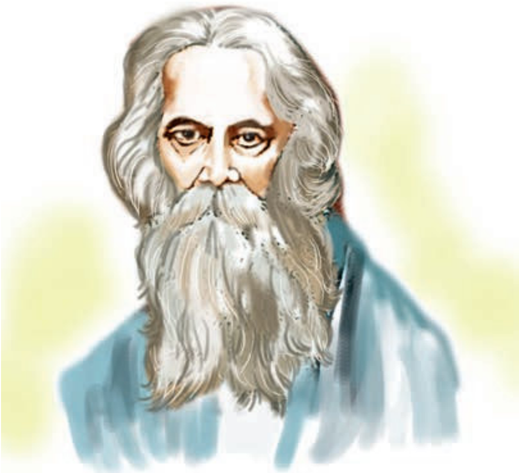

غالبؔ اور ٹیگور یہیں کے میراؔ کالی داسؔ
یہیں ہوا تھا سچّائی کا گوتم کو احساس
یہیں لیا تھا ساتھ رام کے سیتا نے بن باس

یہ ہے میرا ہندستان

(زبیر رضوی)

معنی یاد کیجیے

سرگم	:	راگ کے سات سُروں کا مجموعہ
سُندر	:	خوبصورت
البم	:	مرقع،تصویروں کا مجموعہ
برکھا	:	بارش
پون	:	ہوا
ممتا	:	ماں کا پیار
میرا	:	میرا بائی ایک مشہور شاعرہ جنھوں نے کرشن بھگتی کے گیت لکھے ہیں
کالی داس	:	سنسکرت زبان کے مشہور شاعر اور ڈراما نگار

سوچیے اور بتائیے۔

1. شاعر اس گیت میں کیا کہنا چاہتا ہے؟
2. اس نظم میں شاعر نے کن قدرتی مناظر کا ذکر کیا ہے؟
3. غالبؔ کون تھے؟
4. گوتم بدھ کو کس بات کا احساس ہوا تھا؟
5. ''ہنستا گاتا جیون اس کا دھوم مچاتے موسم
گنگا جمنا کی لہروں میں سات سُروں کا سرگم
تاج ایلورہ جیسے سُندر تصویروں کے البم
یہ ہے میرا ہندستان''

اس بند کا مطلب آسان زبان میں لکھیے۔

مصرعے مکمل کیجیے۔

غالبؔ اور....... یہیں کے میرؔا کالی داسؔ
یہیں..........تھا سچّائی..........گوتم کو احساس
یہیں لیا........ساتھ رام.........سیتا نے بن باس
یہ .... میرا ہندستان

واحد سے جمع اور جمع سے واحد بنائیے۔

سُروں کھیتی لہروں تصویر پریاں

بلند آواز سے پڑھیے۔

لہروں تصویروں مسکائے جھُرمٹ بوڑھی

عملی کام

- اس گیت کو ترنّم سے گروپ کے ساتھ پڑھیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

موسم، سرگم، البم اس گیت کے پہلے بند میں موسم، سرگم، البم قافیے استعمال ہوئے ہیں۔ایک جیسے آواز اور حرف پر ختم ہونے والے الفاظ کو ''قافیہ'' کہتے ہیں۔اس گیت کے باقی بندوں کے قافیوں کو تلاش کر کے لکھیے۔

غور کرنے کی بات

- اس گیت میں شاعر نے خوب صورت تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ جملے یا شعر میں جب دو چیزوں میں مشابہت دکھائی جائے تو

اُسے ''تشبیہ'' کہتے ہیں۔ جس چیز کو تشبیہ دی جاتی ہے اُسے ''مُشبّہ'' اور جس چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے اُسے 'مُشبّہ بہ' کہتے ہیں۔ جیسے اس نظم میں ایک مصرع ہے ؎

تاج ایلورا جیسے سُندر تصویروں کے البم

یہاں تاج محل اور ایلورا کو خوبصورت تصویروں کے البم سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس مصرعے میں تاج محل اور ایلورا مشبہ اور تصویروں کے البم مشبّہ بہ ہیں۔

- ہندوستان کے قدیم ادب میں کالی داس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ شاعری اور ڈراما نگاری کی صنف میں ان کے کمال کا اعتراف بہت بڑے پیمانے پر کیا گیا ہے۔ ان کی تصانیف میں ''میگھ دوت'' اور'' شکنتلا'' بہت مشہور ہیں۔ ان کے ترجمے مغربی زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔

بچّے

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بلّی کے بچے، فاختہ کے بچّے وغیرہ۔ مگر میری مُراد صرف انسان کے بچوں سے ہے جن کی ظاہرا تو کئی قسمیں ہیں کوئی پیارا بچہ ہے اور کوئی ننّھا بچہ ہے، کوئی چاند سا بچّہ ہے اور کوئی پھول سا بچّہ ہے۔ لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب تک برخوردار پنگوڑے میں سویا پڑا ہے۔ جہاں بیدار ہونے پر بچّے کے پانچوں حواس کام کرنے لگ جاتے ہیں یہ میں نے اور حُکما کے تجربات کی بنا پر لکھا ورنہ میں ہرگز اس بات کا قائل نہیں۔ کہتے ہیں بچہ سنتا بھی ہے لیکن ہمیں تو سوائے اس کی قُوّتِ ناطِقہ کے اور کسی قوت کا ثبوت آج تک نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتّفاق ہوا ہے کہ روتا ہوا بچہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ذرا اسے چُپ کرانا۔ میں نے جناب اس بچے کے سامنے گیت گائے ہیں، ناچے ہیں، تالیاں بجائی ہیں۔ گھٹنوں کے بل چل کر نقلیں اتاری ہیں۔ بھیڑ بکری کی سی آوازیں نکالی ہیں۔ سر کے بل کھڑے ہو کر ہوا میں سائیکل چلانے کے نمونے پیش کیے ہیں مگر کیا مجال جو اس بچّے کی یک سوئی میں ذرا بھی فرق آیا ہو جس سُر پر اس نے رونا شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچے اُترا ہو۔ اب خدا جانے دیکھتا ہے اور سنتا ہے تو کس وقت۔

بچّے کی زندگی کا شاید کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جب اس کے لیے کسی نہ کسی قسم کا شور ضروری نہ ہو۔ اکثر اوقات تو خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پر عائد ہوتا ہے۔ ان کو سُلانا ہو تو لوری دیجیے

ہنسنا ہو تو مہمل سے مہمل فقرے، بے معنی سے بے معنی لفظ منھ بنا کر بلند آواز میں ان کے سامنے دہرائیے۔ اور کچھ نہ ہو تو شغلِ بیکاری کے طور پر ان کے ہاتھ میں جھنجھنا دے دیجیے یہ جھنجھنا بھی کم بخت کسی بیکار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں یعنی کسی چیز کو آپ ذرا سا ہلا دیجیے لُڑھکا چلا جاتا ہے۔ اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے متواتر ایک ایسی بے سُری کرخت آواز نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے اور جو آپ نے مامتایا ''باپتا'' کے جوش میں آ کر ایک عدد وہ ربڑ کی گڑیا منگوا دی جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی لگی ہوتی ہے تو بس پھر خدا حافظ۔ اس سے بڑھ کر میری صحت کے لیے مُضر کوئی اور چیز نہیں سوائے شاید اس ربڑ کے تھیلے کے جس کے منھ پر ایک سیٹی دار نالی لگی ہوتی ہے اور جس میں منہ سے ہوا بھی جاتی ہے۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو والدین کہلاتے ہیں۔ بدقسمت تو وہ بیچارے ہیں جو قدرت کی طرح سے اس ڈیوٹی پر مُقرّر رہوئے ہیں کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو دیکھیں تو ایسے موقع پر ان کے ذاتی جذبات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ ضرور کہیں گے کہ'' کیسا پیارا بچہ ہے۔''

میرے ساتھ کے گھر میں ایک مرزا صاحب رہتے ہیں خدا کے فضل سے جو چھ بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر نو سال ہے۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ بہت ہی بے زبان ہیں۔ جب ان میں سے ایک روتا ہے تو باقی سب کے سب بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ جب وہ روتے روتے تھک جاتا ہے تو ان کا دوسرا برخوردار شروع ہو جاتا ہے۔ وہ ہار جاتا ہے تو تیسری کی باری آتی ہے۔ رات کی ڈیوٹی والے بچے الگ ہیں ان کا سُر ذرا باریک ہے۔ آپ

سر میں تیل ڈال کر، کانوں میں روئی ٹھونس کر، لحاف میں منھ لپیٹ کر سوئیے ایک لمحہ کے اندر آپ کو جگا کر اُٹھا کے بیٹھا نہ دیں تو میرا ذمّہ۔

انھیں مرزا صاحب کے گھر پر جب میں جاتا ہوں تو ایک بچے کو بلا کر پیار کرتا ہوں۔ اب آپ یہی بتائیے کہ میں کیا کروں۔ کئی دفعہ دل میں آیا کہ مرزا صاحب سے کہوں کہ حضرت آپ کے اِن نغمہ سرا بیٹوں نے میری زندگی حرام کر دی ہے نہ دن کو کام کر سکتا ہوں نہ رات کو سو سکتا ہوں لیکن میں یہ کہنے ہی کو ہوتا ہوں کہ دوسرا بچہ کمرے میں آ جاتا ہے اور مرزا صاحب ایک پدرانہ تبسّم سے کہتے ہیں ''اختر بیٹا ان کو سلام کرو۔ سلام کرو بیٹا! اس کا نام اختر ہے۔ صاحب بڑا اچھا بیٹا ہے کبھی ضد نہیں کرتا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں یہ وہی نالائق ہے جو رات کو دو دو بجے گلا پھاڑ کر روتا ہے۔ مرزا صاحب قبلہ تو اپنے خرّاٹوں کے زور شور میں کچھ نہیں سُنتے، بدبختی تو ہماری ہوتی ہے۔ لیکن کہتا یہ ہی ہوں ''یہاں آؤ بیٹا''۔ گھٹنے پر بٹھا کر اس کا منھ چومتا ہوں۔ خدا جانے آج کل کے بچے کس قسم کے بچّے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم عید بقرعید کو تھوڑا تھوڑا رو لیا کرتے تھے اور کبھی کبھار کوئی مہمان آ نکلا تو نمونے کے طور پر تھوڑی سی ضد کر لی کیونکہ ایسے موقع پر ضِد کارآمد ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہ کہ چوبیس گھنٹے متواتر روتے رہیں ایسی مشق ہم نے کبھی بہم نہ پہنچائی تھی۔

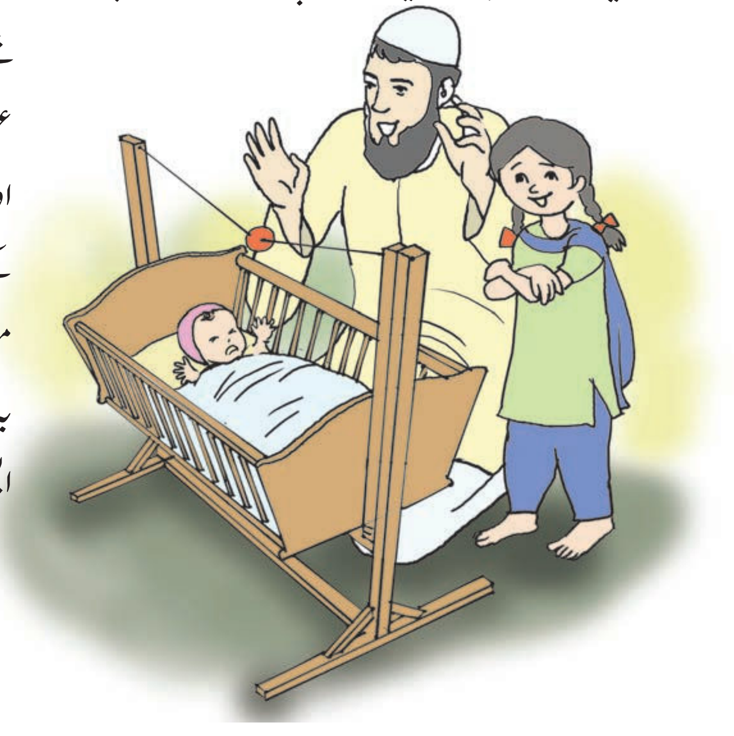

(پطرس بخاری)

معنی یاد کیجیے

پنگوڑے	:	واحد پنگوڑا، بچوں کے پالنے، جھولے
بیدار ہونا	:	جاگنا
حواس	:	حاسّہ کی جمع، محسوس کرنے کی قوت، ہوش، سمجھ، عقل
خطابات	:	خطاب کی جمع، وہ لقب جو کسی کو بطور اعزاز خطاب عطا کیا جائے
بے نیاز	:	ہر طرح کی فکر سے بے پروا
حکما	:	حکیم کی جمع، حکمت والا، عقلمند، ہوردانا
قوتِ ناطِقہ	:	بولنے کی قوت
شغل	:	کام، مشغلہ
سامعہ نوازی	:	سنانا
لواحقین	:	رشتہ دار، گھر کے لوگ
مہمل	:	بے معنی
کرخت	:	سخت، کڑا
مُضِر	:	نقصان دینے والا، نقصان دہ
پدرانہ تبسّم	:	باپ کی محبت بھری مسکراہٹ
کارآمد	:	کام کی، فائدہ مند
متواتر	:	لگاتار

سوچیے اور بتائیے۔

1. بچوں کے پانچوں حواس کب کام کرنا شروع کرتے ہیں؟
2. روتے ہوئے بچے کو چپ کرانے کے لیے مصنف نے کیا تدبیر کی؟

3. مصنّف نے کن والدین کو خوش قسمت کہا ہے؟
4. مرزا صاحب کے بچّے مصنّف کو رات میں کس طرح پریشان کرتے تھے؟
5. بچّوں کی ضد عموماً کس وقت کارآمد ہوا کرتی ہے؟

خالی جگہوں کو صحیح لفظ سے بھریے۔

1. مگر میری مُراد صرف............کے بچوں........ہے۔
2. اس سے بڑھ کر میری صحت کے لیے..........کوئی اور چیز نہیں۔
3. ان نغمہ سرا بیٹوں نے میری .... حرام کردی ہے۔
4. میں اچھی طرح جانتا ہوں یہ وہی............ہے۔
5. خدا جانے آج کل کے..........قسم کے ہیں۔

نیچے ہوئے لفظوں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

بیدار اتفاق بدقسمت لمحہ تجربہ

واحد سے جمع اور جمع سے واحد بنائیے۔

پنگوڑے خطابات حکما شغل موقع نغمہ تجربات فقرہ

عملی کام

- اپنی لائبریری سے پطرس بخاری کی کتاب ''مضامینِ پطرس'' لے کر کچھ اور مضامین پڑھیے۔

پڑھیے اور سمجھیے۔

میں تھکا ہوا ہوں

وہ کپڑے پہنے ہوئے ہے

اس کا لکھا ہوا خط میرے پاس ہے۔

خط کشیدہ الفاظ کام کے اثر کو ظاہر کرتے ہیں۔ انھیں اسمِ مفعول کہتے ہیں۔ لکھا ہوا خط، تھکا ہوا، اسم میں اسمِ مفعول ہیں۔

غور کرنے کی بات

- کبھی کبھی مزاح پیدا کرنے کے لیے عموماً اُلٹی بات بھی کہہ دی جاتی ہے جیسے اس سبق میں بچے کے پریشان کرنے پر یہ کہنا کہ ''کیسا پیارا بچہ ہے'' یا جیسے اس سبق میں بچے کے ناگوار شور اور چیخ پکار کو سامعہ نوازی کہا گیا ہے۔ سامعہ نوازی کے اصل معنی ایسی آواز سنانا جو کانوں کو اچھی لگے۔ اوپر جو سامعہ نوازی کا لفظ آیا ہے اس میں سامعہ کے معنی سننے کی قوت۔ اسی طرح کی چار قوتیں اور بھی ہیں:

قوتِ باصرہ	(دیکھنے کی قوت)
قوتِ ذائقہ	(چکھنے کی قوت)
قوتِ لامسہ	(چھونے کی قوت)
قوتِ شامّہ	(سونگھنے کی قوت)

ان پانچوں قوتوں یا حواس کو ''حواسِ خمسہ'' کہتے ہیں۔

لالچ

''امِرت والا آگیا۔ کیا خوب رنگ جما گیا۔ جو پیے میرا پانی، رہے گرمی نہ گرانی، پِیو میرا ٹھنڈا پانی۔''

یہ جانی پہچانی آواز اس ادھیڑ عُمر غریب آدمی کی ہوتی تھی، جو چمڑے کی بڑی سی مَشک پیٹھ پر لادے شہر کی سڑکوں پر پانی بیچا کرتا تھا۔ وہ دِن بھر یوں ہی چِلاّتا رہتا، تب کہیں جا کر چار پیسے کما تا تھا۔ اس کا اصل نام تو شاید ہی کِسی کو معلوم ہو لیکن پیشے کی نِسبت سے لوگ اسے مشکوب کہہ کر پُکارتے تھے۔

ایک دن مشکوب صُبح ہی سے اپنی مخصوص آوازیں لگا کر سڑکوں کے چکّر کاٹتا رہا لیکن شام تک وہ اتنے پیسے بھی نہ کما پایا جن سے وہ پیٹ بھر کھانا کھا سکتا۔ مایوسی کے عالم میں کھڑا کچھ سوچ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک اجنبی مُسافر پر پڑی۔ مُسافر کے دھول میں اَٹے کپڑوں سے لگتا تھا کہ وہ ایک لمبی مسافت طے کر کے آیا ہے اور خوب تھکا ہوا بھی ہے۔ مُسافر نے مشکوب کی طرف دیکھا۔ مشکوب دِل ہی دِل میں خوش ہوا کہ چلو آخر کار ایک گاہک تو ہاتھ لگا۔ اُس نے پاس جا کر آواز لگائی امِرت والا آگیا، کیا خوب رنگ لگا گیا۔ جو پیے میرا پانی، رہے گرمی نہ گرانی۔ پیو

میرا ٹھنڈا پانی۔ اپنی پیاس بُجھاؤ اور تھکان کو دُور بھگاؤ۔''

مُسافر نے کہا۔'' بھائی! مسافتیں طے کرتے کرتے تو خود ہی ایک سفر بن گیا ہوں۔ اِس وقت بھی بہت دُور سے آ رہا ہوں۔ تھک کر چوُر ہو گیا ہوں۔ پیاس بہت لگ رہی ہے۔ مگر کیا کروں، میرے پاس پیسے نہیں ہیں''۔

مشکوب کو اجنبی مُسافر پر رحم آ گیا۔ اس نے مُسافر کو نہ صرف پانی پلایا بلکہ ایک رات اپنے گھر ٹھہرنے کی اجازت بھی دی۔ مُسافر خوشی خوشی اس کے ساتھ چل دیا۔

صبح ہوتے ہی مُسافر اُٹھ کھڑا ہوا اور مشکوب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔'' بھائی! آپ بڑے مہربان آدمی ہیں۔ آپ نے میرے ساتھ بڑی نیکی کی ہے۔ آپ کی مہمان نوازی کے لیے مَیں بہت شکرگزار ہوں۔ چاہتا ہوں کہ رُخصت ہونے سے پہلے آپ کو ایک مجرّب نُسخہ بتا دوں یہ دوا آپ جس مریض کو بھی دیں گے وہ بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔ اس کی بیماری خواہ کتنی ہی خطرناک کیوں نہ ہو۔'' اس کے ساتھ ہی ایک کتاب مشکوب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔'' اِس کتاب میں اس دوا کی تیاری کا نسخہ اور طریقہ سب کچھ درج ہے۔ ہدایت پر پورا پورا عمل کیجیے اور یاد رکھیے کہ کسی بھی غریب آدمی سے دوا کی قیمت نہ لیجیے ورنہ دوا کا اثر جاتا رہے گا۔''

اس عنایت کے لیے مشکوب کا رواں رواں اجنبی مُسافر کا شکر گزار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مُسافر کا نام جاننا چاہتا تھا لیکن اس سے پیشتر کہ مشکوب کچھ کہہ پاتا، مُسافر چلتا بنا اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

اُسی دِن سے مشکوب نے سڑکوں پر پانی بیچنا بند کر دیا۔ کتاب میں درج نُسخے پر عمل کر کے دوا تیار کی اور مریضوں کا علاج کرنا شروع کر دیا۔ ابتدا میں تو لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ مشکوب کی دوا میں اتنا زبردست اثر ہوگا۔ لیکن جیسے جیسے مریضوں کو اس کی دوا سے شِفا ہونے لگی، اُن کی تعداد بڑھتی گئی۔ لوگ شفاخانہ پر مریضوں کا ہجوم رہنے لگا۔ اور مشکوب کو لوگ حکیم مشکوب کے نام سے مخاطب کرنے لگے۔

اجنبی کی ہدایت کے مُطابق وہ غریبوں کو مُفت دوا دیتا تھا۔ البتّہ امیروں سے خوب پیسے لیتا تھا۔ لوگ مشکوب کی حِکمت کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ مشکوب روز بروز خوش حال ہوتا گیا۔ اُس نے اپنے لیے ایک اچھا سا گھر بنا لیا اور ایک خوب صورت عورت سے شادی کر کے بڑے آرام سے زندگی بسر کرنے لگا۔

جوُں جوُں مشکوب کی دولت بڑھتی گئی لالچ اُسے بہکانے لگا اور وہ سوچنے لگا کہ غریبوں کو مُفت دوا دے کر اُس نے سخت غلطی کی ہے۔ اگر وہ ایسی غلطی نہ کرتا تو آج شہر کا سب سے بڑا دولت مند شخص بن گیا ہوتا۔

اگلے دن ایک بے حد غریب آدمی اپنے بیمار بچّے کے لیے دوا لینے آیا۔ اس کے پھٹے پُرانے کپڑوں اور بد حالی کو دیکھتے ہوئے بھی حکیم مشکوب نے دوا دینے سے پہلے اس سے فیس طلب کی۔ اس غریب نے اپنی مجبوری بیان کر دی لیکن حکیم نے اس کی بے کسی پر غور نہ کیا۔ غریب بے چارہ رونے لگا اور بولا۔ ''حکیم صاحب یقین مانیے میرے پاس پھوُٹی کوڑی بھی نہیں۔ خُدا کے لیے میرے بچّے کی جان بچا لیجیے۔ یہ میرا اِکلوتا بچّہ ہے۔ حکیم صاحب خُدا کے واسطے۔''

حکیم مشکوب غُصّے میں لال پیلے ہو کر چلّائے۔ ''نکل جاؤ یہاں سے، یہاں کوئی خیرات نہیں بٹ رہی ہے جو مُنھ اٹھائے خالی ہاتھ چلے آتے ہو۔ بھاگو یہاں سے ورنہ۔''

غریب بے چارہ تو مایوس لوٹ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حکیم کی دواؤں کا اثر بھی فوراً زائل ہو گیا۔ دوا کو

بے اثر پاکر وہ کتاب تلاش کرنے لگا۔ کتاب غائب ہو چکی تھی۔ اُدھر حافظہ بھی جواب دے چُکا تھا۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ مجرب نُسخہ اسے یاد نہ آیا۔ مریضوں کا ہجوم منتشر ہونے لگا۔ جلد ہی اس کی تمام جمع پونجی ختم ہو گئی۔ رفتہ رفتہ مکان بھی نیلام ہو گیا اور پھر وہ غریبی کی اسی حالت میں پہنچ گیا جہاں سے اُس کے دن پھرے تھے۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ پُرانی مشک کی مرمّت کروائی۔ اب پھر وہی مشک تھی اور وہی مشکوب۔ شہر کی وہی سڑکیں اور مشکوب کی وہی صدائیں۔ امرِت والا آ گیا۔ کیا خوب رنگ جما گیا۔ جو پیے میرا پانی، رہے گرمی نہ گرانی۔ پیو میرا ٹھنڈا پانی۔'' دِن بھر شہر کی سڑکوں پر چلتے چلتے وہ بہت کمزور ہو گیا۔ پھٹے بانس کی طرح آواز بھی بے سُری ہوتی گئی۔ لیکن مشک پیٹھ پر لادے وہ بدستور سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ ایک دن وہ حسبِ معمول گرد آلود سڑکوں پر چکّر لگا رہا تھا کہ دُور ہی سے اس نے ایک سانڈنی سوار کو دیکھا۔ مشکوب اس کی طرف بڑھا تو مُسافر نے کہا۔ ''مشکوب بھائی! میں ایک بے یارو مددگار مُسافر ہوں۔ رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اندھیرا چھانے کو ہے۔ ایک رات کے لیے اگر آپ مجھے اپنے گھر ٹھہرنے کی اجازت دیں تو مَیں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔ مشکوب اس دن کِسی اجنبی کو اپنے گھر ٹھہرانے کے حق میں نہ تھا۔ مگر مہمان نوازی کے سماجی ضابطوں سے مُنھ موڑنا بھی بداخلاقی سمجھتا تھا۔ بادل ناخواستہ بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ چلیے! آج رات آپ میرے ہی گھر پر ٹھہریے۔''

گھر پہنچ کر مشکوب سے جو بھی بن پڑا کھانے پینے کا بندوبست کیا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو مُسافر نے مشکوب کی مہمان نوازی کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''بھائی آپ بہت نیک آدمی ہیں۔ آپ کی مہمان نوازی انعام کی مُستحق ہے۔ مگر اس وقت پیش کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں۔ خیر جو کچھ بھی ہے وہ مَیں آپ کو ضرور دوں گا۔ مَیں ایک کیمیا گر ہوں، اور سونا بنانے کی ترکیب جانتا ہوں۔ یہ راز مَیں آپ کو بھی بتا دوں گا۔ مگر یاد رکھیے کہ سونا ایک قومی دولت ہے۔ قوم کے کروڑوں غریب مزدور جب مِل کر کام کرتے ہیں تو دیش کی یہی مِٹّی سونا اُگلنے لگتی ہے۔ سونے کو پیدا کرنے والے دراصل غریب لوگ ہیں اس لیے آپ کو بھی اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد اپنی باقی دولت کو غریب عوام کی بھلائی کے کاموں میں لگانا ہوگا۔ لیجیے یہ کتاب ''سونا بنانے کے راز'' مَیں آپ

کی نذر کرتا ہوں۔ اسے سنبھال کر رکھیے۔ یہ کہتے ہوئے مُسافر نے مشکوب کو وہ کتاب پیش کی۔

اسی رات مُسافر اور مشکوب نے مِل کر کام کیا اور سونے کی کچھ اینٹیں بھی تیار کر لیں۔ سونے کی اینٹوں کو دیکھ کر مشکوب حیرت سے بُت بنا کھڑا رہا۔ وہ مُسافر کو دروازے تک چھوڑنے بھی نہ جا سکا۔ اور مُسافر چلا گیا۔

مُسافر کے چلے جانے کے بعد مشکوب کافی دیر تک سوچتا رہا کہ اگر لوگوں کو میرے سونے کا پتہ چل گیا تو وہ اِسے چُرا لیں گے۔ اور اگر مَیں یہ سونا غریبوں کو بانٹتا رہا تو خود دولت مند کیسے بنوں گا۔ لالچ نے ایک بار پھر اس کی عقل پر پردہ ڈال دیا۔ اس نے فیصلہ کیا۔

’’میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ مَیں خود امیر بنوں گا۔ لوگ میری عزّت کریں گے اور مَیں ٹھاٹ سے رہوں گا۔ مَیں اپنا سونا بے کار نہیں لُٹاؤں گا۔ کِسی کو نہیں دوں گا۔‘‘

مُسافر کے ساتھ مِل کر بنائی ہوئی سونے کی اینٹوں سے مشکوب نے پھر ایک مکان خریدا۔ اچھے اچھے قالین بچھائے۔ قیمتی سامان سے گھر کو سجایا۔ اور عیش و آرام سے زندگی بسر کرنے لگا۔

کچھ ہی عرصے بعد جب مشکوب کے پاس سے سونے کی تمام اینٹیں ختم ہو گئیں تو اسے مُستقبل کی فِکر ہوئی۔

اس نے فوراً مسافر کی دی ہوئی کیمیا کی کتاب اُٹھائی۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا کہ وہ قیمتی کتاب تو پتّھر میں بدل چکی ہے۔ مستقبل میں روزی کے تمام دروازے بند ہوتے دیکھ کر اس کی چیخ نِکل گئی اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گِر پڑا۔

وقت گزرتا گیا اور کچھ ہی دِنوں کے بعد وہ پھر سے سڑکوں پر گھوم گھوم کر پانی بیچنے پر مجبور ہو گیا۔ ایک دِن جب حسبِ معمول مشک اُٹھائے چکّر لگا رہا تھا کہ ایک گھوڑسوار اس کے بالکل قریب آ کر کہنے لگا۔

''ارے مشکوب! مجھے پہچانتے نہیں۔ اس سے پہلے ہم دو بار مِل چکے ہیں۔ پہلی بار مَیں نے تمھیں ایک لاجواب دوا کی تیاری کا نُسخہ بتایا تھا۔ مگر لالچ میں آ کر تم نے غریبوں کو بھی نہ بخشا اور ان ناداروں سے دوا کے مُنھ مانگے دام وصول کرنے پر تُل گئے۔

مشکوب یہ سن کر گڑگڑایا۔ ''میرے محسن! مجھے معاف کر دیجیے۔ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ لالچ اور خودغرضی نے مجھے اندھا کر دیا تھا اور مجھے دیش کے غریبوں سے بیگانہ بنا دیا تھا۔ اے عظیم انسان! مجھے معاف کر دیجیے۔''

مُسافر نے کہا۔ ''اب مجھے اچھی طرح پہچان لو۔ لوگ مجھے بوعلی سینا کہتے ہیں۔ میری اپنی زندگی غریبوں اور محتاجوں کے لیے وقف ہے۔ مگر تمھاری سَنگ دِلی نے میری محنت پر پانی پھیر دیا اور دو قیمتی کتابوں کو پتّھر بنا دیا۔ اب یہ پتّھر پھر سے قیمتی کتابوں میں اس وقت تک نہیں بدل سکتے جب تک کہ تم جیسے سَنگ دِل لوگ اپنی زندگی غریبوں اور محتاجوں کی بھلائی کے لیے وقف نہ کر دیں۔ جو بھی شخص ایسا کرے گا۔ اس کے دِل کی گرمی ان پتّھروں کو پگھلا سکے گی۔ عِلم اور عقل سونے سے نہیں خریدے جا سکتے بلکہ سونا حاصل کرنے کے لیے عِلم اور عقل کے ساتھ ساتھ دردمند دِل بھی پیدا کرنا پڑتا ہے'' یہ کہہ کر بوعلی سینا نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

(رام آسرا راز)

معنی یاد کیجیے

امرت	:	آبِ حیات، وہ پانی جس کے پینے سے موت نہیں آتی۔
مسافت	:	فاصلہ
مجرّب	:	آزمایا ہوا
زائل ہونا	:	مٹ جانا، ختم ہو جانا
جمع پونجی	:	وہ دولت جو بچا کر رکھی جائے
گرانی	:	بھاری پن
بادلِ ناخواستہ	:	نہ چاہتے ہوئے
مہمان نوازی	:	مہمان کی خاطرداری
کیمیا گری	:	سونا بنانے کا عمل
ناداروں	:	نادار کی جمع، جس کے پاس کچھ نہ ہو، مفلس، غریب
محسن	:	احسان کرنے والا
سنگ دل	:	پتھر دل، بے رحم
اوجھل	:	غائب

سوچیے اور بتایئے۔

1. مشکوب کو اجنبی مسافر پر کیوں رحم آیا؟
2. مسافر نے مشکوب کو کیا ہدایت دی؟
3. مشکوب حکیم مشکوب کیسے بنا؟
4. دواؤں کا اثر کیوں زائل ہو گیا؟
5. سانڈنی سوار نے مشکوب کو اپنے بارے میں کیا بتایا؟

6. قیمتی کتاب پتھر میں کیوں تبدیل ہوگئی؟
7. مسافر سے مشکوب نے گڑگڑا کر کیا کہا؟
8. بوعلی سینا کون تھے اور انھوں نے مشکوب سے کیا کہا؟

نیچے لکھے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

مجرب بِادلِ ناخواستہ کیمیا گری مربی جمع پونجی اوجھل مسکین

ان لفظوں کے متضاد لکھیے۔

تندرست اجنبی خوش حال مُستحق نادار

محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

عقل پر پردہ پڑ جانا	:	عقل کا جاتے رہنا
نشہ ہرن ہونا	:	ہوش میں آ جانا
پتھر پگھلانا	:	مشکل کام کو آسان کر دینا
تھک کر چور ہونا	:	بہت زیادہ تھک جانا

صحیح جملے پر صحیح (✓) اور غلط پر غلط (×) کا نشان لگائیے۔

1. پیشے کی نسبت سے لوگ اسے مشکوب کہہ کر پکارتے تھے۔ ( )
2. مشکوب کو اجنبی مسافر پر رحم آ گیا۔ ( )
3. مسافر نے مشکوب کو مجرّب نسخہ نہیں دیا۔ ( )
4. نسخہ پا کر بھی مشکوب سڑکوں پر پانی بیچتا رہا۔ ( )

5. مشکوب کی دوائیں اثر والی نہیں تھیں۔ ( )
6. لوگ مشکوب کے نام سے مخاطب کرنے لگے۔ ( )
7. ایک دن ایک غریب آدمی اپنے بیمار بچّے کی دوا لینے آیا۔ ( )
8. مشکوب کی نسخے والی کتاب غائب ہوگئی۔ ( )
9. اجنبی مسافر بوعلی سینا تھے۔ ( )

عملی کام

○ اس کہانی کومختصر طور پر اپنے لفظوں میں لکھیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

''مسافر'' کا مطلب ہے''سفر کرنے والا'' یہ اسمِ فاعل ہے یعنی ایسا اسم جس سے کسی کام کے کرنے کا پتہ چلے''اسمِ فاعل'' کہلاتا ہے۔درج ذیل کواسمِ فاعل میں بدل کرلکھیے۔

طلب کرنے والا
شعر کہنے والا
شکر ادا کرنے والا
عبادت کرنے والا
حفظ کرنے والا

غور کرنے کی بات

○ یہ بڑی دلچسپ کہانی ہے، اس کو پڑھنے کے بعد بچّوں تمھیں غور کرنا چاہیے کہ لالچ بڑی بُری بلا ہے۔ لالچ کی وجہ سے انسان ہمیشہ نقصان اٹھاتا ہے، جیسا کہ اس کہانی میں مشکوب نے اُٹھایا، اگر وہ مسافر کے کہنے پر عمل کرتا رہتا تو خود بھی فائدے میں رہتا اور اللہ کے بندے بھی اس سے فیض پاتے رہتے۔

- مسافر کو بوعلی سینا نے نصیحت کرتے ہوئے کہا، ''میری زندگی غریبوں اور محتاجوں کے لیے وقف ہے۔ علم اور عقل، سونے سے نہیں خریدے جا سکتے۔''
- بوعلی سینا پرانے زمانے کے مشہور حکیم اور سائنس داں تھے۔ ان کا پورا نام بوعلی حسین بن عبداللہ بخاری تھا۔ 22 سال کی عمر میں سیر و سیاحت پر نکلے، اور دنیا کی خوب سیر کی۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں شفا اشارات اور قانون زیادہ مشہور ہیں۔ ان کتابوں کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ تمام بڑے سائنسدانوں اور طبیبوں نے ان کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔

مہمان

کردار

جمیل: دفتر میں اسسٹنٹ کی اسامی پر فائز ھے | ناز : ثریّا کی سہیلی

ثریّا : جمیل کی بیوی | اکبر : نا ز کا شوھر

بُدّھو : نوکر

پہلا منظر

(جمیل کے مکان کا ایک کمرہ)

ثریّا : میں پوچھتی ہوں بار بار حساب جوڑنے سے مشکل حل ہو جائے گی کیا؟

جمیل : (اپنے آپ سے) تین سو۔ تین سو پچھتّر۔ یہ ہوئے چار سو.....

ثریّا : بار بار گننے سے ان رقموں کی میزان کم ہو جائے گی کیا؟

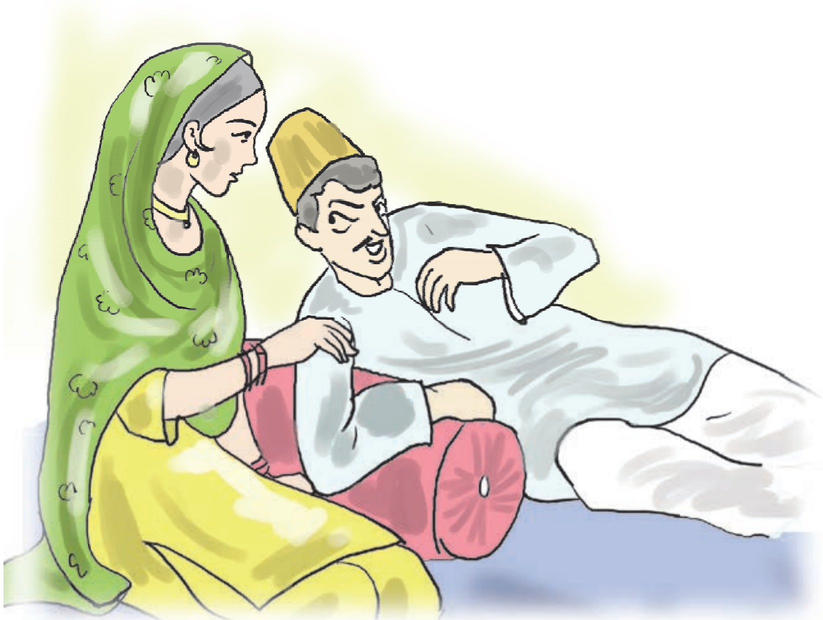

جمیل : لیکن اتنی ساری رقم کیسے ادا کریں گے؟ اب کی بار 252 تو تنخواہ کے آئیں گے اور تین سو بقایا ملے گا یعنی کل رقم 552 ہوگی۔

ثریّا : ٹھیک تو ہے۔ 532 قرض ادا کریں گے۔ باقی بچے بیس، اللہ کے فضل سے ہو جائے گا گزارہ۔

جمیل : تم تو مذاق کرتی ہو۔ بیس روپے میں مہینہ کیسے گزرے گا؟

ثریّا : اگر میں کہوں اللہ کے فضل سے ہو جائے گا تو کہتے ہیں مذاق کرتی ہو اور جب آپ خود کہا کرتے ہیں ''تم نہیں سمجھتیں ثریّا۔ اللہ کے فضل سے ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس وقت؟

جمیل : لاحول ولاقوۃ۔ پھر وہی مذاق۔ ذرا سنجیدگی سے سوچو نا!

ثریّا : میں کیا سوچوں! میری سنتا ہی کون ہے؟

(دروازہ پر کھٹکا ہوتا ہے)

جمیل : ہائیں یہ کون؟ بدھّو، او بدھّو!

ثریّا : ہوگا ہمارا ہی کوئی دوست۔ ادھر چائے کا وقت ہوا، اُدھر کوئی آ پہنچا۔ کیوں نہ آئے اللہ کے فضل سے کھاتا پیتا گھر ہے۔ اب ان کو کیا معلوم کہ اندر سے کیا حالت ہے؟

بدّھو : (آکر) جی بابو جی!

جمیل : کھڑا کیا ہے۔ باہر جاکر دیکھ کون آیا ہے۔

بدّھو : بہت اچھا بابو جی! (باہر جاتا ھے)

جمیل : نوکر بھی وہ لائے ہیں چن کر جس کا جواب نہیں۔

بدّھو : (داخل ھو کر) باہر تو کوئی نہیں ہے بابو جی۔ یہ پرچی سی پڑی تھی ڈیوڑھی میں۔

ثریّا : دکھا تو (بدّھو پرچی ثریّا کو دکھاتا ھے) جا تو' اب جا کر کپڑے استری کر۔

بدّھو : اچھا جی!

ثریّا : ہے اللہ، یہ تو ایک اور بل ہے۔

جمیل : ایک اور بل!

ثریّا : پانی کا بل ہے۔ پندرہ روپے بارہ آنے کا۔

جمیل : اتنا بل!

ثریّا : اس وقت تو پروا نہیں ہوتی جب آپ نہانے لگتے ہیں۔ گھنٹوں شپا شپ ہوتی رہتی ہے۔

جمیل : میں تو صرف ایک بار نہاتا ہوں۔ دو بالٹیاں ڈالیں اور باہر نکل آیا۔ البتّہ تم دن میں بتّیس مرتبہ ہاتھ مُنھ دھوتی ہو۔

ثریّا : توبہ ہے۔ فضول خرچ خود ہیں اور الزام مجھ پر دھرتے ہیں۔

جمیل : اب یہ سولہ روپے اور بڑھ گئے پانی کے بل کے۔

ثریّا : ہے! میں تو بھول ہی گئی ایک بل اور بھی ہے۔

جمیل : نہ نہ........خدا کے لیے اسے بھولی ہی رہو، ورنہ اپنا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

ثریّا : وہ بل ہے بھی تو ڈاکٹر کا۔

جمیل : اوہ! وہ تو بڑا ضروری ہے۔

ثریّا : میرا کیا ہے میں تو کبھی بیمار پڑتی ہی نہیں۔ آپ ہی مہینے میں ایک بار شیشی بھروا کر لے آتے ہیں ڈاکٹر سے۔

جمیل : بیمار پڑ جاتا ہوں اگر میں، تو کیا میرا قصور ہے؟

ثریّا : اور کیا میرا ہے؟

جمیل : اب لڑنے سے کیا فائدہ! سوال تو یہ ہے کہ کیا کریں؟

ثریّا : مجھ سے پوچھتے تو میں کہوں گی تمام بل ادا کر دیجیے۔

جمیل : تمام بل ادا کر دیں تو خود یتیم خانے میں داخل ہو جائیں یا پیٹ پر پتھر باندھ لیں۔

ثریّا : دیکھیے اس مُصیبت سے نکلنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ یہ روز کے بہانے اب نہیں چلیں گے،

بہتر یہی ہے کہ ہم بل ادا کریں اور ایک مہینے کی چھٹی لے کر کسی کے گھر مہمان بن کر جائیں۔ اتفاق سے بچّوں کی چھٹیاں ہیں۔ صرف آپ ہی کو چھٹی لینی پڑے گی۔

جمیل : بھئی واہ! کیا بات سوجھی ہے۔

ثریّا : اس طرح اس ماہ کا خرچ بھی نہ ہوگا اور قرضہ بھی سارے کا سارا ادا ہو جائے گا۔

جمیل : خدا کی قسم بڑی اچھی تجویز ہے۔

ثریّا : صرف جانے آنے کا کرایہ لگے گا۔

جمیل : تو میں کل ہی چھٹی کے لیے درخواست دے دوں؟

ثریّا : مل جائے گی کیا؟

جمیل : کیوں نہیں۔ افسر بے چارہ بڑا اچھا ہے۔ اگر کل درخواست دوں تو پرسوں سے چھٹی منظور ہو جائے گی اور کل تنخواہ اور بقایا کے دونوں بل بھی مل جائیں گے۔

ثریّا : تو پھر، ہم کل بل وغیرہ ادا کر کے، شام کی گاڑی سے روانہ ہو جائیں؟

جمیل : ٹھیک ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جائیں کہاں؟

ثریّا : لو، ایک ہی جگہ تو ہے جانے کے لیے۔

جمیل : وہ کون سی؟

ثریّا : اے ہے، ناز کے یہاں اور کہاں؟ اللہ کے فضل سے کھاتا پیتا گھرانہ ہے۔ ملازمت بھی ہے اور ایمان کی بات یہ ہے کہ عید کے چاند کی طرح ہماری راہ دیکھتی ہے۔

جمیل : ہاں بھئی ہے بڑی محبّت والی اور اس کے میاں اکبر بھی خوب آدمی ہیں۔ واہ! واہ!

ثریّا : پردہ وہ نہیں کرتی، نہ میں اکبر صاحب سے پردہ کرتی ہوں پھر ان کا گھر بھی صاف سُتھرا اور فراخ ہے اور پھر شملہ۔ منظر بھی خوب صورت اور آب و ہوا بھی اچھی ہے۔

جمیل : واہ واہ بیگم! کیا بات پیدا کی۔ وہی بات ہوئی نا۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ ایک تو قرضہ اُتر جائے گا اور دوسرے شملہ کی سیر مفت میں۔

ثریّا : آپ جو کہتے تھے کوئی تجویز بتاؤ تو میں نے کہا بتا ہی دو۔

جمیل : اس وقت تو کمال کر دیا تم نے ثریّا۔ اگر میں ہفت اقلیم کا بادشاہ ہوتا تو اس تجویز پر ساری بادشاہی تمھیں بخش دیتا۔

ثریّا : پہلے قرضہ تو چکا دیجیے پھر بادشاہت بخش دینا۔

جمیل : قرضہ؟ قرضہ تو سمجھ لو سب ادا ہو گیا۔ آج رات یوں بے فکری سے سوئیں گے کہ بس۔

بدّھو : (باہر سے) بابو جی، بابو جی۔ آ گئے۔ آ گئے۔

جمیل : ہائیں، یہ کیا چلّا رہا ہے؟

بدّھو : (چلّاتے ہوئے داخل ہوتا ہے) بابو جی۔ بابو جی وہ آ گئے۔

جمیل : ابے کیا بکتا ہے؟

ثریّا : کون آ گئے بدّھو؟

بدّھو : کہہ تو رہا ہوں کہ مے مان آ گئے۔

جمیل : مہمان آ گئے ہیں؟

ثریّا : کون مہمان آئے ہیں؟

بدّھو : وہ باہر تانگے سے سامان اُتروا رہے ہیں جی!

ثریّا : سامان اُتروا رہے ہیں؟

بدّھو : ہاں بیگم جی، وہی شملہ والے جو پچھلے سال آئے تھے۔

ثریّا : ہائیں! کیا ناز یہاں پہنچ گئی؟

جمیل : یہ کیسے ہوسکتا ہے، ہم تو خود وہاں جا رہے ہیں۔

بدّھو : جی وہی شملہ والی بیگم صاحبہ اور ان کے صاحب۔ (باهر جاتا هے)

ثریّا : (سر پکڑ کر بیٹھ جاتی هے) ہیے یہ کیا ہوگیا؟

جمیل : سمجھ لو تباہ ہو گئے بیگم!!

(ناز دوڑی دوڑی داخل هوتی هے)

ناز : ہے، میں تو تمھیں دیکھنے کو ترس گئی تھی۔

ثریّا : شُکر ہے اللہ کا۔ میری ناز آئی۔

ناز : ہے۔ میں تو کب سے انتظار کر رہی تھی کہ کب انھیں چھٹّی ملے اور کب، ہم تمھارے پاس پہنچیں۔

(اکبر داخل هوتا هے)

اکبر : السّلام علیکم۔ کہیے مزاج اچھے ہیں؟

جمیل : آیئے آیئے۔ اب کی مرتبہ تو بہت راہ دکھائی۔

اکبر : ملازم جو ٹھہرے۔ کل کہیں دو مہینے کی چھٹّی منظور ہوئی اور آج یہاں پہنچ گئے۔

ثریّا : آنے کی اطلاع ہی نہ دی، حد کر دی آپ نے۔

ناز : تو اطلاع کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو بلکہ چاہتی تھی کہ ایک دم تمھارے گلے لگ جاؤں، ایک دم۔

ثریّا : ہے! مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔(دونوں بغلگیر ہوتی ہیں)

جمیل : اکبر صاحب۔آپ کی صحت تو ماشاء اللہ.....

اکبر : نہیں بھئی۔ میں تو بالکل دُبلا ہو گیا ہوں۔

ثریّا : میں کہتی ہوں پہلے چائے پئیں گے یا.....

اکبر : ہم تو اسٹیشن پر کھانا کھا کر آئے ہیں۔

ثریّا : کوئی غیر کے گھر تو نہیں آنا تھا کہ اسٹیشن پر کھانا کھا کر آتے۔چھی، بھائی جان!

ناز : میں نے کہا بھی کہ ثریّا بُرا مانے گی، لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی۔

اکبر : بھئی غلطی ہو گئی۔آئندہ سے نہ ہوگی۔

ثریّا : تو اب پیاس تو لگی ہوگی نا۔آپ اُٹھیے نا ذرا۔

ناز : بھئی اب تکلّف نہ کرنا۔

ثریّا : اے ہے، اس میں تکلّف کی کیا بات ہے۔(جاتی ھے)

جمیل : میں ابھی آیا۔ جب تک آپ ذرا پسینہ سکھا لیجیے۔(باھر جاتا ھے)

اکبر : آج کل پسینہ کہاں سوکھتا ہے! (ھنستا ھے)

(کچھ دیر خاموشی۔ اکبر اخبار دیکھتا ھے۔ ناز بیکار بیٹھی ھے)

ناز : دیکھا، میری تجویز کیسی رہی۔ آپ تو مانتے ہی نہیں تھے۔

اکبر : مجھے کیا پتہ کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔

ناز : کچھ پتہ بھی ہے آپ کو۔ بے کار سارا دن اللہ ماری کتابیں اُلٹتے رہتے ہیں۔

(اکبر ھنستا ھے)

ناز : اب دو ماہ میں کم از کم چھ سو روپیہ بچ جائے گا۔

اکبر : بالکل!

ناز : اور چار سو مکان کا کرایہ آ جائے گا۔ یہ ہوا ایک ہزار۔ ہزار میں سے چھ سات سو کے اچھے جوڑے بن جائیں گے نازلی کے لیے اور باقی روپیہ شادی پر لین دین کے کام آئے گا۔

اکبر : بڑی اچھی تجویز سوجھی ہے تمھیں، کیا بات ہے۔

ناز : اور نہ پھر کسی کا احسان اور نہ گلہ شکایت۔ اپنی سہیلی کا گھر، جس طرح چاہو رہو اور جب تک جی چاہے رہو۔

اکبر : ہاں بھئی، بڑی اچھی سہیلی ہے آپ کی۔

ناز : دونوں ہی ایسے اچھے ہیں، کیا بتاؤں۔

بدّھو : (داخل ہو کر) صاحب سامان لگا دیا ہے آپ کے کمرے میں۔

ناز : کون سے کمرے میں لگایا ہے بدّھو؟

بدّھو : بیگم صاحبہ، اُسی کمرے میں جہاں آپ پہلے ٹھہرے تھے۔ چل کر دیکھ لیجیے۔

ناز : ہاں ہاں، چلیے نا دیکھ لیں اپنا کمرہ۔

اکبر : ہاں، ہاں ٹھیک ہے۔ دو مہینہ ٹھہرنا ہے یہاں۔

(تینوں جاتے ھیں۔ کچھ دیر اسٹیج خالی رہتا ھے)

(دوسرا منظر)

جمیل : (اپنے دھیان میں داخل ھوتا ھے۔ ھاتھ میں اخبار ھے۔) یہ خبر دیکھی آپ نے اکبر صاحب؟ (کمرے کو خالی دیکھ کر) ارے، یہ لوگ کہاں گئے؟

ثریّا : (ساتھ ساتھ داخل ھوتی ھے۔) اپنا کمرہ دیکھنے گئے ہیں۔

جمیل : اب کیا ہوگا بیگم؟ اب تو لینے کے دینے پڑ گئے۔

ثریّا : ہے! مجھے کیا معلوم تھا کہ یوں ہوگا۔

جمیل : تو پھر اب کیا کریں؟

ثریّا : میں نے کہا آپ کے پاس کوئی تار کا فارم ہے؟

جمیل : معلوم نہیں، شاید ہو۔ کیوں تار دینا ہے کیا؟

ثریّا : اونہوں!

جمیل : تو پھر؟

ثریّا : کوئی ایسی تجویز کیجیے کہ کہیں سے تار آ جائے۔

جمیل : کہاں سے آ جائے تار؟

ثریّا : اے ہے، کہیں سے آ جائے۔ علی گڑھ سے آ جائے کہ خالہ سخت بیمار ہیں۔

جمیل : خدانخواستہ خالہ کیوں بیمار ہوں؟

ثریّا : او ہو، آپ سمجھتے نہیں۔ میں کب کہتی ہوں کہ خالہ بیمار ہوں۔ خالی تار ہی آ جائے۔ پھر اسی بہانے ہم علی گڑھ جانے کو تیار ہو جائیں گے اور ناز کو مجبوراً جانا پڑے گا۔

جمیل : اوہ، یہ بات ہے۔ لیکن تار کیسے آئے؟

ثریّا : اے ہے، جھوٹ موٹ کا تار فارم بھر کر دروازے سے پھینک دیں اور دروازہ کھٹکھٹائیں تو بدّھو اُٹھا لائے گا۔ وہ سمجھیں گے تار والا پھینک گیا ہے۔

جمیل : ہاں، یہ تو ہوسکتا ہے۔

ثریّا : تو پھر آپ جلدی کریں۔

جمیل : اچھا!

(اُٹھ کر جاتا ہے۔ ثریا بیٹھ کر بُنتی ہے۔ سوچتی ہے۔ بدھو ٹرے اٹھائے داخل ہوتا ہے۔ ٹرے میں شربت کا جگ ہے اور چار گلاس۔)

ثرّیا : (بدھو کو دیکھ کر) ناز! (با آواز بلند) بھائی جان، اب آ بھی جایئے نا!

(ناز اور اکبر داخل ہوتے ہیں)

ثریّا : اے ہے، پانی تو پی لیجیے۔ پیاس تو لگی ہوگی؟

(ناز اور اکبر بیٹھ جاتے ہیں۔ثریا گلاس بھر کر دیتی ہے)

ثریّا : لیجیے شکنجبین کا شربت!

ناز : بھائی جان کہاں گئے؟

ثریّا : اُدھر اپنے کمرے میں ہیں۔

ناز : انھیں بلاؤ نا!

ثریّا : ابھی آجائیں گے۔تم فکر نہ کرو۔ شکنجبین کی خوشبو پہنچے گی تو خود بھاگے آئیں گے۔

اکبر : ثریا، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دُبلی ہوگئی ہو تم!

ثریّا : دبلی تو نہیں بھائی جان۔ ویسے آپ جانتے ہیں انسان کو فکر لگی ہو تو..........

اکبر : فکر؟ کیسی فکر؟

ثریّا : وہی خالہ کی فکر ہے۔

ناز : خالہ کی؟ کون سی خالہ؟

ثریّا : لو، ایک ہی تو خالہ ہیں میری، علی گڑھ میں!

ناز : آخر ہوا کیا خالہ کو؟

ثریّا : اے ہے، تانگے میں جا رہی تھیں اپنی سہیلی کی طرف کہ موٹر سے ٹکر ہوگئی۔

ناز : ہائیں ٹکّر ہوگئی؟

ثریّا : ویسے چوٹ نہیں آئی، لیکن صدمہ پہنچا ہے۔

ناز : شکر ہے اللہ کا۔ میں سمجھی..........

ثریّا : اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے۔مگر جب تک خیریت کی خبر نہ آئے تو فکر لگی ہی رہے گی۔

اکبر : وہ تو ہے۔

ناز : چلو، اب تو اللہ نے فضل کر دیا۔

(دروازہ پر دستک)

ثریّا : بدھو! او بدھو! ! باہر جا کر دیکھ دروازے پر کون ہے؟

بدھوّ : (داخل ہو کر) مجھے بلایا بیگم صاحبہ؟

ثریّا : لو دیکھ لو، اللہ مارا، بالکل بدھو ہے۔ کہہ رہی ہوں باہر جا کر دیکھ کون ہے؟ اور تو یہاں آ کر پوچھتا ہے مجھ سے۔توبہ ہے۔

جمیل : (ہاتھ میں تار کا فارم اٹھائے داخل ہوتا ہے۔) ثریا تار!

ثریّا : ہائے اللہ تار!!

جمیل : خالہ کی حالت، اچھی نہیں۔

ثریّا : ہائے خالہ! (چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتی ہے)

ناز : پنکھا۔ پنکھا۔اے ہے پانی۔ پانی لاؤ میں منہ پر چھینٹے دوں۔ یا اللہ کیا ہو گیا میری ثریا کو!

جمیل : گھبراؤ نہیں......میں ابھی سونگھنے کی دوا کی شیشی لاتا ہوں۔

(جمیل فوراً باہر جاتا ہے اور بدھو بھی پانی لانے کے لیے باہر جاتا ہے)

اکبر : سارا کیا کرایا تباہ ہو گیا بیگم۔

ناز : آپ تو چھوٹی سی بات پر گھبرا جاتے ہیں

اکبر : میں کہتا ہوں.........

ناز : اونہوں! ہش!! (ثریا کی طرف اشارہ کرتی ہے)

اکبر : یہ تو بے چاری بے ہوش پڑی ہے۔ میں کہتا ہوں، اچھے بچائے چھ سو روپے۔

ناز : اونہوں! ہش!! (آهسته سے) کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

(بدھو پانی لے کر داخل ہوتا ہے)

(جمیل شیشی لے کر آتا ہے اور ثریا کو سنگھاتا ہے۔ ثریا ہوش میں آتی ہے اور ہوں ہوں کرنے کے بعد دفعتاً چلاتی ہے)

ثریّا : میں میں تو ابھی جاؤں گی خالہ کے پاس۔ ابھی۔

ناز : اے ہے! اس حالت میں؟

ثریّا : چاہے کچھ بھی ہو۔

جمیل : اس وقت اسے کچھ نہ کہو ناز بہن! (ثریا سے) میں ابھی لیے چلتا ہوں تمھیں، گھبراؤ نہیں۔ خدا خیر کرے گا۔

ثریّا : بس کا وقت ہے ابھی تانگہ منگوا لیں اور میرے سوٹ کیس میں دو جوڑے رکھ دیں۔ نہیں، نہیں میں آپ رکھ لوں گی۔

ناز : نہیں، نہیں!

ثریّا : اب میں ٹھیک ہوں، ٹھیک ہوں۔ اوں اوں، معاف کرنا ناز۔ مگر مجبوری ہے۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔ ارے بدھو سوٹ کیس لے آ میرا۔ بھاگ کر جا۔

بدھوّ : بہت اچھا بیگم صاحبہ (جاتا ہے)

ثریّا : وقت کیا ہوا ہے بھائی جان؟

اکبر : ایک بجنے میں دس منٹ ہیں۔

ثریّا : اوہ، وقت بہت کم ہے۔ آپ جا کر رکھ دیں کپڑے میرے سوٹ کیس میں اور بدھو کو بھیج دیں تانگہ

لانے کے لیے۔ ہائے ناز کتنا افسوس ہے مجھے۔ تمھارا سارا پروگرام تباہ ہوگیا۔ تمھیں کتنی تکلیف ہوئی۔

جمیل : بدھو، بدھو۔ (بدھو آتا ھے) جا، فوراً تانگہ لے آ۔

بدھوّ : ابھی لایا بابو جی!

ثریّا : بڑی تکلیف ہوئی تمھیں۔

جمیل : آخر پروگرام خراب ہوا آپ کا۔

ناز : لو اس میں خرابی کی کیا بات ہے، تمھارے ساتھ جائیں گے اور پھر ساتھ ہی واپس آ جائیں گے۔

ثریّا : کیا کہا، ساتھ؟

ناز : اور کیا!

ثریّا : نہیں۔ نہیں۔ تمھیں تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

ناز : نہ ثریا، جیسے تمھاری خالہ، ویسے میری۔ اے ہے، آپ جا کر اٹھا لائیں نا سوٹ کیس۔ وقت بہت کم ہے۔

اکبر : جی ابھی لاتا ہوں۔ (جاتا ھے)

ثریّا : لیکن ناز!

ناز : (منھ پر ھاتھ رکھ دیتی ھے) نہ ثریا۔ اس بات میں تمھیں میری ضد ماننا پڑے گی۔ میں تو ضرور جاؤں گی چاہے کچھ ہو۔

جمیل : (ایک طرف) یا اللہ تو ہی عزت رکھنے والا ہے۔

ثریّا : میری بات تو سنو۔

ناز : نہیں، میں نہیں سنوں گی۔

بدھوّ : (کمرے میں داخل ھو کر) وہ آ گئے صاحب، وہ آ گئے۔

جمیل : وہ آ گئے، وہ آ گئے کیا؟ یہ کہہ تانگہ لے آیا ہے۔

بدھوّ : جی، تانگے پر ہی آئی ہیں وہ!

جمیل : ابے کیا بکتا ہے؟

ثریّا : اسے بات تو کرنے دو، کون آیا ہے بدھو؟

بدھوّ : مے مان آئے ہیں بیگم صاحبہ!

جمیل : مہمان!

ثریّا : کون مہمان؟ کوئی ان سے ملنے آیا ہے کیا؟

بدھوّ : جی نہیں، علی گڑھ والی خالہ آئی ہیں۔

ثریا : کیا کہا؟

جمیل : ارے!

اکبر : ہائیں!

بدھو : وہ جو علی گڑھ والی خالہ ہیں وہ آئی ہیں۔ تانگے سے سامان اُتروا رہی ہیں۔

ثریّا : (سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے) میرے اللہ!

(جمیل بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنستا ہے۔ جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔ ناز اور اکبر اس کا حیرانی سے مُنہ دیکھتے ہیں)

اکبر : جمیل، یہ کیا ہو گیا تمھیں، کیا بات ہے؟

جمیل : اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں..........

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

(ممتاز مفتی)

معنی یاد کیجیے

میزان	:	ترازو، یہاں مراد حساب ہے
بقایا	:	باقی
گزارہ	:	بسر اوقات
لاحول ولاقوۃ	:	عربی فقرہ، یہاں یہ فقرہ نہایت بیزاری اور ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے کہا جاتا ہے جو لاحول ولاقوۃ اللہ باللہ کا حصّہ ہے
ڈیوڑھی	:	پرانے زمانے کے گھروں کی باہری کوٹھری
ہارٹ فیل ہونا	:	دل کی حرکت بند ہو جانا یعنی موت واقع ہو جانا
تجویز	:	مشورہ، رائے
فراخ	:	کشادہ، وسیع
آم کے آم گٹھلیوں کے دام (محاورہ)	:	دوہرا فائدہ
اقلیم	:	ملک، دیس
ہفتِ اقلیم	:	سات ملک، مُراد ساری دنیا، پُرانے زمانے میں کرۂ زمین کو سات حصّوں میں تقسیم کیا جاتا تھا اور ہر حصّہ اقلیم کہلاتا تھا۔
اللہ ماری	:	جس پر اللہ کی مار ہو، ایک قسم کا کوسنا
لینے کے دینے پڑ جانا (محاورہ)	:	نفع کی بجائے نقصان پہنچنا
تار	:	ٹیلی گرام
شکنجبین	:	لیموں کے عرق کا پکا ہوا شربت
کیا کرایا تباہ ہو جانا	:	بنا بنایا منصوبہ ناکام ہو جانا

سوچیے اور بتائیے۔

1. جمیل بار بار حساب کیوں جوڑ رہا تھا؟
2. ثریا کی تجویز سے خوش ہو کر جمیل نے کیا کہا؟
3. جمیل کے گھر مہمان بن کر کون لوگ آئے؟
4. جمیل اور ثریا نے اکبر اور ناز کا استقبال کس طرح کیا؟
5. اکبر اور ناز کی ترکیب کیا تھی؟
6. ثریا کی ترکیب کیوں ناکام رہی؟
7. ''اب تو لینے کے دینے پڑ گئے'' جمیل نے یہ کیوں کہا؟
8. ثریا نے مہمانوں سے چھٹکارا پانے کے لیے کیا ترکیب سوچی؟
9. ثریا کی ترکیب ناکام کیسے ہوئی؟

خالی جگہ کو صحیح لفظ سے بھریے۔

1. بار بار گننے سے ان رقموں کی ....کم ہو جائے گی کیا؟
2. کیوں نہ آئے، اللہ کے ....سے کھاتا پیتا گھر ہے؟
3. تمام بل ادا کر دیں تو خود ....میں داخل ہو جائیں یا.........باندھ لیں۔
4. میں ابھی سونگھنے کی دوا کی ....شیشی لاتا ہوں۔
5. جی نہیں...........خالہ آئی ہیں۔

نیچے لکھے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

میزان گزارہ تجویز فراخ مہمان منظر ترکیب

فضل پروگرام حیرانی

بلند آواز سے پڑھیے۔

فراخ　　ہفتِ اقلیم　　تکلّف　　اطلاع　　ماشاالله　　تجویز　　اتفاق　　آب و ہوا

املا درست کر کے لکھیے۔

مذاک　　ڈیوڑی　　بکایا　　فجل　　غلتی

عملی کام

- اس ڈرامے کو اپنے اسکول کے اسٹیج پر پیش کیجیے۔
- اس ڈرامے کو کہانی کی شکل میں لکھیے۔

پڑھیے، سمجھیے اور لکھیے۔

ختمہ(۔)، سکتہ(،)، رابطہ(:) اور واوین(''　　'') سے متعلق ہم نے آپ کو پچھلے سبق میں بتایا تھا۔ ذیل کے پیراگراف میں رموز اوقاف کا استعمال کیجیے۔

ممبئ میں سمندر کے کنارے ایک بستی ہے یہ بستی پہلے بہت چھوٹی تھی لیکن بڑھتے بڑھتے ممبئ کا ایک حصّہ بن گئی ہے ہر سال دسمبر کے مہینے میں یہاں عُرس ہوتا ہے۔ چاروں طرف دکانیں ہی دکانیں، کھلونوں کی دکانیں وغیرہ کھلونے بھی کتنے خوبصورت ہیں پیاری پیاری گڑیا چابی سے چلنے والی بس موٹر اور ریل جی چاہتا ہے پوری دکان خرید لیں مجھے ایک شخص ملا اس نے پوچھا کیا تم نے مجھے پہچانا میں نے جواب دیا شاید کہیں آپ کو دیکھا ہے۔

غور کرنے کی بات

- آم کے آم گٹھلیوں کے دام

یہ ایک کہاوت ہے کہاوتوں کے استعمال سے ہم اپنی بات میں حسن پیدا کر سکتے ہیں۔

- ''عید کے چاند کی طرح ہماری راہ دیکھتی ہے۔''

اس جملے میں انتظار کی شدت کو ظاہر کرنے کے لیے مثال دی گئی ہے۔عید کا چاند سال میں ایک ہی بار نظر آتا ہے۔ بچے اور بڑے سبھی اُسے دیکھنے کے لیے بڑے بے تاب رہتے ہیں۔اسی طرح ہمیں اپنی گفتگو میں جب یہ ظاہر کرنا ہو کہ بڑی بے تابی اور بے چینی سے انتظار کیا جا رہا ہے تو عید کے چاند کی مثال دی جاتی ہے۔

- ہم اپنی بات کو خوبصورت انداز میں بیان کرنے کے لیے کبھی کبھی نثر کے درمیان اشعار کا بھی استعمال کرتے ہیں۔کبھی پورا شعر، کبھی ایک مصرعہ یا کبھی مصرعے کا ایک ٹکڑا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سبق میں آخری مکالمہ الٹی ہو گئیں سب تدبیریں...(میر تقی میرؔ) بھی ایک شعر کا جزو ہے۔مکمل شعر اس طرح ہے۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں ، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا